احیائے اسلام اور امن عالم کا داعی کثیر الاشاعت میگزین

ماہنامہ منہاج القرآن لاہور

جنوری 2024ء

حضور نبی اکرم ﷺ کی جسمانی و روحانی معراج

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کا خصوصی خطاب

تربیتِ اولاد اسوۂ مصطفیٰ ﷺ کی روشنی میں

ضرورتِ مذہب اور وجودِ باری تعالیٰ

عصرِ حاضر کا اَخلاقی اِنحطاط

اسباب اور اثرات کا تحقیقی جائزہ

دستورِ مدینہ اور فلاحی ریاست کا تصور

فاقہ اور کم خوری

اہمیت، فضیلت اور ضرورت

سیرت وفضائلِ نبوی ﷺ کے ذکرِ جمیل پر مشتمل عظیم ذخیرۂ علم

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی گراں قدر تصانیف

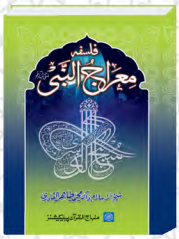

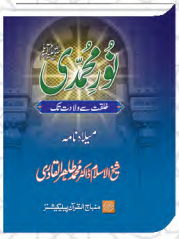

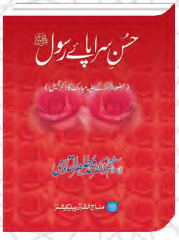

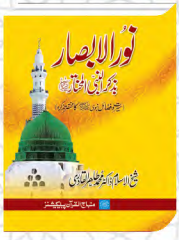

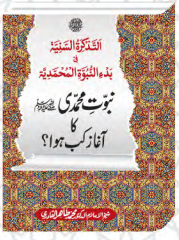

احیائے اسلام اور امن عالم کا داعی کثیر الاشاعت میگزین

ماہنامہ منہاج القرآن لاہور

بفیضان نظر
قدوۃ الاولیاء شیخ المشائخ حضرت سیدنا طاہر علاؤالدین القادری الگیلانی البغدادی قدس سرہ العزیز

زیر سرپرستی
شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری مدظلہ

زیر نگرانی
ڈاکٹر حسن محی الدین قادری | ڈاکٹر حسین محی الدین قادری

جلد: 38 / شمارہ: 1 | جمادی الثانی / رجب ۱۴۴۵ھ | جنوری 2024ء

چیف ایڈیٹر: نور اللہ صدیقی

ایڈیٹر: محمد یوسف

ڈپٹی ایڈیٹر: محبوب حسین

ایڈیٹوریل بورڈ
محمد رفیق انجم، محمد فاروق رانا
عین الحق بغدادی

مجلس مشاورت
خرم نواز گنڈاپور، احمد نواز انجم، جی ایم ملک
محمد جواد حامد، سرفراز احمد خان، منظور حسین قادری
غلام مرتضیٰ علوی، سید علی عباس بخاری، فیصل حسین مشہدی
محمد بلال اُپل، علی عمران، داؤد حسین مشہدی

قلمی معاونین
مفتی عبدالقیوم خان ہزاروی، محمد شفقت اللہ قادری
ڈاکٹر طاہر حمید تنولی، پروفیسر محمد الیاس اعظمی
ڈاکٹر ممتاز احمد سیدی، ڈاکٹر محمد افضل قادری

حسن ترتیب

اداریہ:	''دستورِ مدینہ اور فلاحی ریاست کا تصور''	چیف ایڈیٹر	3
القرآن:	حضور نبی اکرم ﷺ کی جسمانی و روحانی معراج	شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری	6
الفقہ:	آپ کے فقہی مسائل	مفتی عبدالقیوم خان ہزاروی	20
	تربیتِ اولاد: اسوۂ مصطفی ﷺ کی روشنی میں	ڈاکٹر حسن محی الدین قادری	25
	ضرورتِ مذہب اور وجودِ باری تعالیٰ	ڈاکٹر حسین محی الدین قادری	35
	عصرِ حاضر کے اخلاقی انحطاط کے اسباب	ڈاکٹر شفاقت علی شیخ	45
	اسلامی مقصدِ حیات	علامہ ارشد علی جیلانی	58
	نماز اور صحت	ایس ایم نور	67
	فاقہ اور کم خوری: اہمیت، فضیلت اور ضرورت		75
	''فلسفۂ قتل اور شانِ مصطفی ﷺ'' (تعارفِ کتاب)	نور اللہ صدیقی	79

کمپیوٹر آپریٹر: محمد اشفاق انجم | گرافکس: عبدالسلام
خطاطی: محمد اکرم قادری | سکاسی: قاضی محمود الاسلام

قیمت فی شمارہ: 60 روپے | سالانہ خریداری: 700 روپے

ملک بھر کے تعلیمی اداروں اور لائبریریوں کیلئے منظور شدہ
www.minhaj.info
www.facebook.com/minhajulquran
email:mqmujallah@gmail.com (مجلّہ آفس و سالانہ خریداران)
minhaj.membership@gmail.com (نظامت ممبر شپ/رفقاء)
smdfa@minhaj.org (بیرون ملک رفقاء)

انتباہ!
مجلّہ منہاج القرآن میں آنے والے جملہ پرائیویٹ اشتہار خلوص نیت سے شائع کئے جاتے ہیں ادارہ کی کسی کاروبار میں شراکت ہے اور نہ ہی ادارہ فریقین کے درمیان کسی بھی قسم کے لین دین کا ذمہ دار ہوگا۔

بدل اشتراک: مشرق وسطی جنوب مشرقی ایشیاء، یورپ، افریقہ، آسٹریلیا، کینیڈا، مشرق بعید جنوبی امریکہ و ریاستہائے متحدہ امریکہ 30 امریکی ڈالر سالانہ

ترسیل زر کا پتہ: اکاؤنٹ نمبر 02930103644000 میزان بینک شالیمار لنک روڈ لاہور پاکستان

ناشر: محمد اشرف قادری، مطبع: منہاج القرآن پرنٹرز 365 ایم ماڈل ٹاؤن لاہور UAN:042-111-140-140 Ext: 128

حمدِ باری تعالیٰ

ہے کائنات اُس کا حسین پرتو جمال
خالق ہے دو جہاں کا وہ معبودِ لایزال

اِک حرفِ کُن سے جس کے ہو تخلیقِ عالمیں
کیسے ہو اُس کی قدرتِ کامل کا اِمتثال

وہ ہے بدیعِ ارض و سماوات و شش جہات
صنعت اسی کی گلشنِ ہستی کے خدوخال

اُس بادشہ کی سلطنتِ اختیار سے
ہونا بروں کسی کا ہے نہ ممکن و محال

روزی رساں ہے ہرکس و ناکس کا وہ الٰہ
ہر اِک کو پالتا ہے وہی رب ذوالجلال

دستِ کرم سے اُس کو اٹھاتا ہے وہ کریم
کرتی ہے جس کو گردشِ افلاک پائمال

یارب ہو تیری ذات میں مجھ کو فنا نصیب
باقی رہے نہ معرفتِ فرقت و وصال

ہے گرچہ معصیت مری بے حد و بے شمار
اِس کو محیط ہیں ترے الطافِ باکمال

ہو نزع دم سجا لبِ ارشدؔ پہ تیرا نام
تیری صدائیں ساتھ رہیں بعدِ اِنتقال

﴿حکیم ارشد محمود ارشدؔ﴾

نعتِ رسولِ مقبول ﷺ

ابتدا کی خیر ہو اور انتہا کی خیر ہو
”ہر قدم پر عاشقانِ مصطفیٰ ؐ کی خیر ہو“

جو ہوا میلادِ محبوبِ خدا سے فیض یاب
اس مبارک شہر مکہ کی فضا کی خیر ہو

جس کے چھونے سے ملے مردہ دلوں کو زندگی
شہرِ طیبہ کی ہوائے جاں فزا کی خیر ہو

آؤ ان کی آل کے در پر چلیں بن کر گدا
خیر بھی دیتے ہیں کہتے ہیں گدا کی خیر ہو

ربِ کعبہ! ظلمِ اہلِ کفر حد سے بڑھ چکا
ہے تجھی سے اب دعا اہلِ غزا کی خیر ہو

کررہے ہیں جو فدا جانیں نبی کے نام پر
ان کی جرأت اور حمیت اور وفا کی خیر ہو

یا الٰہی جس بھی خطے میں ہے دنیا کے مقیم
ہر جگہ پر امتِ خیرالوریٰ کی خیر ہو

جن سے ہمذآنی جہاں کو نعت کا ورثہ ملا
کعبؓ و حسانؓ و بوصیریؒ اور رضاؒ کی خیر ہو

﴿انجینئر اشفاق حسین ہمذآنی﴾

اداریہ

’’دستورِ مدینہ اور فلاحی ریاست کا تصور‘‘

ان شاء اللہ تعالیٰ ماہِ جنوری 2024ء کے آخری ہفتہ میں منہاج القرآن انٹرنیشنل کی سپریم کونسل کے چیئرمین ڈاکٹر حسن محی الدین قادری کی شہرۂ آفاق تصنیف کی تقریبِ رُونمائی لاہور میں منعقد ہو گی۔ ملکی و بین الاقوامی، علمی، قانونی حلقے اس تصنیف کے شدت سے منتظر ہیں۔ الحمدللہ یہ تصنیف بیک وقت عربی، انگریزی اور اُردو زبان میں شائع ہونے کا اعزاز حاصل کر رہی ہے۔ وطنِ عزیز میں پچھلے چند سالوں میں ریاستِ مدینہ کے موضوع پر سیاسی، سماجی اور معاشرتی فورمز پر بہت گفتگو ہوئی مگر گہرائی کے ساتھ دستورِ مدینہ اور ریاستِ مدینہ کے موضوع پر بحث کی پیاس کو شدت سے برابر محسوس کیا جاتا رہا ہے۔ یہ پیاس بھی بالآخر تحریک منہاج القرآن نے بجھائی اور چیئرمین سپریم کونسل نے دستورِ مدینہ اور فلاحی ریاست کے موضوع پر کتاب رقم کر کے صدیوں سے اُمت کے ذمہ واجب الادا قرض ادا کر دیا۔

جب حضور نبی اکرم ﷺ مدینہ تشریف لائے تو آپ ﷺ نے انتظامی معاملات کو سدھارنے اور مستقبل کی ریاست کے انتظامی ڈھانچے کے خدوخال اُبھارنے اور سنوارنے کے لئے ابتدائی امور کی طرف توجہ فرمائی۔ مدینہ منورہ میں آپ ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے کوئی دستور یا انتظامی ڈھانچہ موجود نہ تھا۔ باہمی تنازعات کی وجہ سے لوگ باہم دست و گریبان تھے۔ آپ ﷺ نے سب سے پہلے انصار و مہاجرین میں مواخات کا رشتہ قائم کیا۔ اس سے نہ صرف مہاجرین کے معاشی مسائل حل ہوئے بلکہ مقامی سطح پر ایک ایسی مثبت تعمیری اور صحت مندانہ فضا پیدا ہوئی جس نے مستقبل کے انتظامی اور ریاستی ڈھانچے کے روبہ عمل ہونے کی راہ میں حائل تمام رکاوٹوں کو منہدم کر دیا۔ حضور نبی اکرم ﷺ کے مدینہ طیبہ تشریف لانے کے بعد اس بات کے واضح امکانات پیدا ہو گئے کہ اب مدینہ

طیبہ انتشار و افتراق اور لا قانونیت کی کیفیت سے نکل کر ایک لائقِ رشک منظم معاشرے میں ڈھل جائے گا۔

آپ ﷺ نے مدینہ طیبہ میں ورودِ مسعود فرمانے کے بعد آئینی ریاست کی تشکیل اور اس کے متفقہ دستور کی طرف خصوصی توجہ دیتے ہوئے اسے اپنی اولین ترجیح بنایا۔ حضور نبی اکرم ﷺ کی سیاسی و معاہداتی اور آئینی و دستوری جدوجہد میں میثاقِ مدینہ ایک نمایاں اور اساسی سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ دستور مدینہ کے آرٹیکلز ریاست کی حاکمیت اعلیٰ کے تعین کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ کی پیغمبرانہ بصیرت اور کمال دستوری مہارت کے شاہد بھی ہیں۔ آپ ﷺ نے اپنی پیغمبرانہ بصیرت و فراست کی بنا پر شروع ہی سے ایسے اقدامات کئے جن کی بنا پر ایک متفقہ دستور کی منظوری کی راہ ہموار ہوئی جس سے دنیا میثاق مدینہ کے نام سے متعارف ہے۔ میثاق مدینہ دنیا کا پہلا تحریری دستور ہونے کے ناطے نہ صرف امتیازی حیثیت کا حامل ہے بلکہ اپنے نفس مضمون کے اعتبار سے بھی اعلیٰ ترین دستوری اور آئینی خصوصیات کا مظہر ہے۔ اگر جدید آئینی و دستوری معیارات اور ضوابط کی روشنی میں میثاق مدینہ کا تجزیہ کیا جائے تو وہ تمام بنیادی خصوصیات جو ایک مثالی آئین میں ہونی چاہئیں میثاق مدینہ میں بہ تمام و کمال نظر آتی ہیں۔

دستورِ مدینہ کے موضوع پر محترم ڈاکٹر حسن محی الدین قادری کی یہ کتاب 2 جلدوں اور 1200 سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے کل 7 ابواب ہیں۔ اس کتاب میں دستور مدینہ کا جدید دساتیر کے ساتھ تقابل کر کے واضح کیا گیا ہے کہ دستور مدینہ؛ ریاست کی نوعیت و حیثیت، افراد ریاست کی آئینی حیثیت، ریاست کے فرائض، ریاست کے باشندوں کے حقوق اور دیگر ریاستی اُمور سمیت تمام تفصیلات کا جامع احاطہ کرتا ہے۔ اسلام کی تاریخ میں اس موضوع پر امتیازی شان کی حامل یہ اپنی نوعیت کی منفرد تصنیف ہے۔ اس کتاب کے امتیازات و تفردات اور بعض خصوصیات کا ذکر ذیل میں کیا جا رہا ہے تاکہ اس مختصر تحریر کے ذریعے اس عظیم علمی شاہ کار سے متعارف ہوا جا سکے:

۱۔ یہ کتاب میثاقِ مدینہ پر پہلی کثیر الجہات تجزیاتی تحقیق ہے۔

۲۔ اس کتاب میں عالم اسلام کی ممتاز یونیورسٹی جامع الازہر کے شیوخ کی تقاریظ شامل ہیں۔

۳۔ اس تحقیقی کتاب میں امریکی، برطانوی و یورپی دساتیر سے بھرپور تقابلی موازنہ پیش کیا گیا ہے۔

۴۔ اس تحقیق سے یہ بات ثابت کی گئی ہے کہ ریاست مدینہ تاریخ عالم کی پہلی ویلفیئر سٹیٹ تھی۔ جمہوریت کے بانی برطانیہ میں 1215ء میں ''میگنا کارٹا'' کے نام سے ایک معاہدہ وجود میں آیا جبکہ

دستورِ مدینہ کی تسوید و تحریر اس معاہدہ سے 593 سال قبل کی گئی۔ ''میگنا کارٹا'' کا معاہدہ یکطرفہ طور پر تحریر کیا گیا جبکہ میثاقِ مدینہ ایک سے زائد اقوام اور مذاہب کے نمائندوں نے اتفاق رائے سے تحریر کیا۔ دیگر قدیم معاہدوں میں ایک خاندان، گروہ یا قبیلہ کے انفرادی اقدار کو دائمی بنانے کی کوشش کی گئی جبکہ دستور مدینہ میں اجتماعیت کے مفاد کو مد نظر رکھا گیا۔

۵۔ اس کتاب میں یونان، روم سمیت قبل مسیح کی قدیم تہذیبوں میں آئین سازی کی مختصر تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ ریاست مدینہ کے ماڈل کو سمجھنے کے لئے مفید مواد ہے۔

۶۔ اس تحقیق دقیق میں قاری کو قبل مسیح کی تاریخ بھی پڑھنے کا موقع ملے گا جس سے وہ اندازہ لگا لیں گے کہ ریاست مدینہ کا انتظامی، معاشی، فلاحی ماڈل سب سے بہترین ہے جو ماضی کی کسی تہذیب سے مستعار نہیں لیا گیا۔

۷۔ اس کتاب کے مطالعہ سے عرب معاشرہ کے خدوخال اور معروضی حالات سے بھی آگاہی میسر آتی ہے۔

۸۔ اس میں انتہائی خوبصورتی کے ساتھ قبل مسیح کی تہذیبوں کا عہدِ رسالت مآب ﷺ سے موازنہ کیا گیا ہے اور ایک تاریخی تقابلی جائزہ قاری کے سامنے شرح وبسط سے رکھا گیا ہے۔

۹۔ اس کتاب کے مطالعہ سے یہ منفرد اور یگانہ حقیقت بھی آشکار ہوتی ہے کہ قدیم تہذیبیں حکمرانوں کے مظالم کی وجہ سے ہونے والی بڑی پیمانے پر ہجرت کی بنا پر برباد ہوئیں اور مہاجر بھی ذلیل و رسوا ہوئے جبکہ ریاست مدینہ ہجرت کی برکت سے آباد ہوئی اور ریاست مدینہ میں ہجرت کرنے والوں کو عزت و تحفظ اور وقار و افتخار ملا۔ معلوم شدہ اور معروف قدیم تہذیبوں میں آمریت کا غلبہ تھا اس کے علی الرغم ریاست مدینہ شورائی نظام سے پھلی پھولی۔ اس نظام کی روح بامقصد مشاورت تھی۔

اس کتاب میں محترم ڈاکٹر حسن محی الدین قادری نے دستور مدینہ کا امریکی، برطانوی، یورپی دساتیر سے موزانہ کیا ہے۔ کتاب میں بتایا گیا ہے کہ امریکہ کا آئین 1776ء میں بنا۔۔۔ برطانیہ کا غیر تحریر آئین 1911ء میں پاس ہوا۔۔۔ جبکہ دستور مدینہ 622ھ میں کئی صدیاں قبل حضور نبی اکرم ﷺ کی جلیل المرتبت اور رفیع الشان نگرانی میں ضبط تحریر میں لایا جا چکا تھا۔ دستور مدینہ دنیا کا قدیم ترین اور اولین تحریری دستور ہے جو ریاست کی تشکیل، قومیت، مساوات، عدل، شوریٰ، آزادی، امن اور بہبود انسانی جیسے دستوری ضوابط پر مشتمل ہے۔

(چیف ایڈیٹر: ماہنامہ منہاج القرآن)

حضور نبی اکرم ﷺ کی جسمانی اور روحانی معراج

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کا علمی و روحانی خصوصی خطاب

ترتیب و تدوین: محمد یوسف منہاجین

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰی۔ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰی۔ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی۔ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ يُّوْحٰی۔

(النجم، ۵۳: ۱تا۴)

”قسم ہے روشن ستارے (محمد ﷺ) کی جب وہ (چشم زدن میں شبِ معراج اوپر جا کر) نیچے اترے۔ تمہیں (اپنی) صحبت سے نوازنے والے (رسول ﷺ جنہوں نے تمہیں اپنا صحابی بنایا) نہ (کبھی) راہ بھولے اور نہ (کبھی) راہ سے بھٹکے۔ اور وہ (اپنی) خواہش سے کلام نہیں کرتے۔ اُن کا ارشاد سَراسَر وحی ہوتا ہے جو انہیں کی جاتی ہے۔“

حضور نبی اکرم ﷺ کی معراج کے بیان کے تناظر میں اللہ تعالیٰ کو سورج، چاند، ستاروں کی قسم کھانے کی ضرورت نہیں ہے، اس لیے کہ معراج النبی ﷺ سے ان اشیاء کی کوئی مناسبت اور جوڑ نہیں بنتا۔ لہذا یہاں ”النجم“ سے مراد وہ ستارہ نہیں جو آسمان پر چمکتا ہے بلکہ اس سے مراد ذاتِ مصطفی ﷺ ہے۔ امام جعفر الصادق رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

النجم ھو محمد ﷺ۔ (تفسیر المظہری، ۹: ۱۰۳)

”ستارے سے مراد محمد مصطفی ﷺ ہیں۔“

سورج ستارہ ہے جبکہ چاند (قمر) سیارہ ہے۔ سیارے کی اپنی روشنی نہیں ہوتی، وہ چمکتا ہوا نظر ضرور آتا ہے مگر اس کے اپنے اندر نور نہیں ہوتا۔ چاند اور زمین ایک سیارہ ہیں، جس طرح ہم اہل زمین کو چاند چمکتا ہوا نظر آتا ہے، اسی طرح اگر ہم چاند پر چلے جائیں تو ہمیں زمین چمکتی ہوئی نظر آئے گی۔ گویا نور چاند اور زمین کا اپنا نہیں ہے بلکہ نور سورج کا ہے، اسکی روشنی جب نظام شمسی کے سیاروں پر پڑتی ہے تو وہ روشن ہو جاتے ہیں جبکہ دوسری طرف ستاروں کی اپنی روشنی اور حرارت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر مختلف گیسیں اور مادہ رکھا ہے جن کے جلنے سے نور اور روشنی پیدا ہوتی ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے حضور نبی اکرم ﷺ کو کسی بھی جگہ چاند (قمر) نہیں کہا۔ اس لیے کہ حضور نبی اکرم ﷺ دنیا میں کسی کے نور سے نہیں چمکتے بلکہ آپ ﷺ کو اللہ کا عطا کردہ نور حاصل ہے۔ باقی ہر نبی اور ولی چاند اور سیاروں کی مثل ہیں اور وہ نورِ مصطفی ﷺ کی روشنی سے منور ہیں۔ آپ ﷺ تو ایسا سورج ہیں کہ خود تو چمکتے ہی ہیں مگر جس پر توجہ فرمادیں، اسے بھی چمکا دیتے ہیں۔۔۔ جس پر اپنے فیض کی کرنیں ڈال دیں، اسے بھی نور کر دیتے ہیں۔۔۔ خود تو نور ہیں مگر جدھر توجہ کر دیں، اسے بھی نور کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور نبی اکرم ﷺ کو سورج اور ستارے سے تشبیہ دی مگر کسی بھی جگہ چاند سے تشبیہ نہیں دی۔ اسی بناء پر اللہ تعالیٰ نے حضور نبی اکرم ﷺ کے سفر معراج کو بیان کرنے سے قبل آپ ﷺ کو ”النجم“ فرمایا۔

معراج مصطفی ﷺ کے اس سفر میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو درج ذیل روحانی اسفار بھی کروائے:

۱۔ جسم مبارک کی معراج
۲۔ عقل کی معراج
۳۔ نفس مبارک کی معراج
۴۔ قلب اطہر کی معراج
۵۔ روح مبارک کی معراج
۶۔ سر کی معراج
۷۔ سر السر کی معراج

گویا یہ سفر معراج حضور نبی اکرم ﷺ کے ظاہر کا بھی معراج تھا اور آپ ﷺ کے باطن کا بھی معراج تھا۔ یہ معراج آپ ﷺ کی جسمانیت اور روحانیت دونوں کی معراج ہونے کے سبب ایک کامل معراج تھا۔ ذیل میں اس سفرِ معراج کے دوران آپ کے چند روحانی اسفار اور معراج کا ذکر کیا جارہا ہے:

۱۔ ارادہ سے محبت تک کا سفر

سفرِ معراج میں آپ ﷺ کی روحانی معراج کا پہلا سفر ”ارادہ سے محبت تک کا سفر“

ہے۔آپ ﷺ نے اپنا ارادہ ترک کیا اور اس ارادہ کو اپنی محبت کی طرف لے گئے۔اس حقیقت کا علم ہمیں اللہ رب العزت کے اس فرمان سے ہوتا ہے:

سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ۔(الاسراء،۱۷: ۱)

”وہ ذات (ہر نقص اور کمزوری سے) پاک ہے جو رات کے تھوڑے سے حصہ میں اپنے (محبوب اور مقرّب) بندے کو لے گئی۔“

اللہ تعالیٰ نے معراج کے بیان میں حضور نبی اکرم ﷺ کے فعل کی بھی نفی کر دی اور ارادۂ فعل کی بھی نفی فرما دی کہ معراج پر جانے میں نہ حضور نبی اکرم ﷺ کا فعل تھا اور نہ اس فعل میں ان کا ارادہ کار فرما تھا۔ یاد رکھیں! فعل؛ ارادے سے وجود میں آتا ہے۔اگر انسان کا فعل اپنا ہو تو ارادہ بھی اس کا اپنا ہو گا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ میرا برگزیدہ بندہ معراج پر گیا بلکہ آپ ﷺ کا جانا بیان ہی نہیں کیا اور جانے کی نفی کر دی اور جب جانے کے فعل کی نفی کر دی تو ارادہ بھی نہ رہا۔

اللہ تعالیٰ نے حضور نبی اکرم ﷺ کو سورج اور ستارے کی تشبیہ دی کسی بھی جگہ چاند سے تشبیہ نہیں دی

اللہ تعالیٰ نے واضح فرما دیا کہ میرے محبوب کے اس شان سے عالمِ بیداری میں معراج پر جانے پر اعتراض کیوں ہے حالانکہ میرے محبوب نے تو یہ دعویٰ ہی نہیں کیا کہ میں گیا ہوں۔دعویٰ تو میں نے کیا ہے کہ میں انھیں لے گیا۔ لہذا تمھارا یہ اعتراض میرے محبوب پر نہیں بلکہ مجھ پر ہے اور مجھ پر تم یہ اعتراض کر ہی نہیں سکتے، اس لیے کہ میں ہر شے پر قادر ہوں۔ گویا اللہ رب العزت نے واضح فرما دیا کہ بات ان کے جانے کی نہیں ہے بلکہ میرے لے جانے کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اپنے محبوب کے ساتھ محبت کا عالم یہ ہے کہ جس مقام پر وہ دیکھتا ہے کہ میرے محبوب پر کوئی اعتراض کرے گا، وہاں وہ حضور کے دفاع میں خود سامنے آجاتا ہے اور فرماتا ہے کہ یہ میں نے کیا ہے، اب کسی نے اعتراض کرنا ہے تو کر کے دکھاؤ۔اس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کے خلاف بولی جانے والی سب کی زبانیں خاموش کروا دیں۔

اسریٰ بعبدہ کے الفاظ واضح کر رہے ہیں کہ اللہ نے حضور نبی اکرم ﷺ کی طرف فعل اور ارادہ کی نسبت نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ اس سفر کے آغاز سے ہی حضور ﷺ کا ارادہ، محبت میں فنا

ہو گیا تھا۔ یاد رکھیں کہ جب تک بندے کا اپنا ارادہ رہے، وہ محب نہیں ہوتا۔ جب تک بندہ اپنا ارادہ رکھے تو سمجھیں کہ اسے کسی سے محبت نہیں ہے۔ اس لیے کہ جب کسی سے محبت ہو جائے تو محبت کی علامت یہ ہے کہ وہ بندے کے اپنے ارادے ختم کر دیتی ہے۔ ارادہ جوں جوں محبت میں گم اور ضم ہوتا چلا جاتا ہے توں توں محبت کامل ہوتی چلی جاتی ہے اور جب محبت کمال پر پہنچتی ہے تو کسی بھی سطح پر بندے کا اپنا کوئی ارادہ نہیں رہتا۔ اس امر کی وضاحت اس حدیث قدسی سے ہوتی ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَا يَزَالُ عَبْدِي يَتَقَرَّبُ إِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتَّى أُحِبَّهُ، فَإِذَا أَحْبَبْتُهُ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِي يَسْمَعُ بِهِ، وَبَصَرَهُ الَّذِي يُبْصِرُ بِهِ وَيَدَهُ الَّتِي يَبْطِشُ بِهَا، وَرِجْلَهُ الَّتِي يَمْشِي بِهَا۔

(صحیح بخاری، ۵: ۲۳۸۴، الرقم: ۶۱۳۷)

”میرا بندہ فرض ادا کرنے کے بعد نفل عبادتیں کر کے مجھ سے اتنا نزدیک ہو جاتا ہے کہ میں اس سے محبت کرنے لگ جاتا ہوں۔ پھر جب میں اس سے محبت کرنے لگ جاتا ہوں تو میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے، اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔“

گویا قریب تو بندہ ہوتا چلا جاتا ہے مگر محبت وہ کرتا چلا جاتا ہے۔ پس جو بندہ اللہ کا قرب تلاش کرتا ہے، اللہ اس سے محبت کرنا شروع کر دیتا ہے۔ گویا اب بندے کا اپنا ارادہ فنا ہو گیا اور محبت کی علامت ہی یہ ہے کہ اپنا ارادہ ختم اور محبوب کا ارادہ غالب ہو جاتا ہے۔ اس سفر معراج میں اسریٰ بعبدہ کے الفاظ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے اپنا ارادہ فنا کر دیا تھا اور معراج پر آپ ﷺ اپنے ارادے سے نہیں گئے بلکہ اللہ کے ارادے سے گئے ہیں۔

حضور نبی اکرم ﷺ کے سفرِ معراج پر جانے کی انفرادیت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اللہ سے ہم کلام ہونے کے لیے کوہِ طور پر جانے سے واضح ہو جاتی ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ سے ہم کلام ہونے کے لیے تشریف لے گئے تو قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا۔ (الاعراف، ۷: ۱۴۳)

”اور جب موسیٰ (علیہ السلام) ہمارے (مقرر کردہ) وقت پر حاضر ہوا۔“

اس آیت میں اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں فرما رہا ہے کہ وہ ہمارے مقرر کیے گئے وقت پر مقررہ جگہ پر آئے۔ اُس کی طرف موسیٰ علیہ السلام بھی گئے اور حضور نبی اکرم ﷺ بھی گئے مگر موسیٰ کے جانے کو اللہ نے فرمایا کہ جآء موسیٰ، موسیٰ علیہ السلام آئے مگر جب حضور نبی اکرم ﷺ کے جانے کا ذکر کیا

تو فرمایا: اسریٰ بعبدہ، اللہ اپنے خاص بندے کو لے گیا۔ پس جب تک اپنا ارادہ چھوڑتے نہیں ہیں، تب تک محبت نصیب نہیں ہوتی۔ اگر ہم اللہ کا محب بننا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے ارادے کو اللہ کے ارادے میں فنا کرنا ہوگا اور اگر اللہ کا محبوب بننا چاہتے ہیں تو اپنے ارادے کا نام و نشان بھی مٹانا ہوگا۔

هَوٰی کا ایک معنی خواہش ہے۔ یہ خواہش جب شدید ہو جائے تو محبت کہلاتی ہے۔ والنجم اذا هوی میں حضور ﷺ کی طرف ''هوی'' کو منسوب کیا گیا ہے جبکہ اسی سورت کی ایک آیت میں وما ینطق عن الهوی میں حضور ﷺ سے ''هوی'' کی نفی کی گئی ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ اپنی ''هوی'' سے کلام نہیں کرتے۔ معلوم ہوا کہ هوی کے دو معنی ہیں:

سفرِ معراج آپ ﷺ کا روحانی معراج کا پہلا سفر ارادہ سے محبت تک کا سفر ہے

۱۔ اگر هوی (محبت، خواہش) غیر کی ہو، اپنے نفس، جان، ارادے، پسند اور اپنے ہونے کی خواہش ہو تو اس ''هوی'' کے بارے میں اللہ نے فرمایا کہ میرا محبوب اس ''هوی'' کو چھوڑ چکا ہے۔

۲۔ اگر هوی (خواہش، محبت) اس اللہ کی ہو تو فرمایا کہ میرا محبوب اس ''هوی'' کو اپنا چکا ہے۔

اذا هوی کا معنی ائمہ لغت نے بیان کیا ہے: اِذَا حَبَّ وَاشْتَهَاهُ۔

''جب انھیں محبت ہو گئی اور محبت شدید ہو گئی۔''

پس والنجم اذا هوی تو مراد یہ ہے کہ قسم ہے ستارے محمد ﷺ کی کہ جب ہماری محبت تیرے دل میں بھڑک اٹھی، ہماری محبت شدید ہو گئی اور اشتہاء کے ساتھ عشق میں بدل گئی۔ گویا اللہ فرما رہا ہے کہ جب حضور ﷺ کو شدید محبت ہو گئی تو انھوں نے نہ صرف اپنا ارادہ ترک کر دیا بلکہ میری محبت میں اپنے ارادے کو فنا کر دیا۔ یہ حضور ﷺ کی معراج کے سفر کا پہلا مرحلہ تھا کہ آپ ﷺ ارادے سے سفر کر کے محبت تک پہنچے۔

۲۔ محبت سے معرفت تک کا سفر

سفرِ معراج میں آپ ﷺ کی روحانی معراج کا دوسرا مرحلہ ''محبت سے معرفت تک کا سفر''

ہے۔ یہ سفر اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے واضح ہو رہا ہے۔ ارشاد فرمایا:

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى۔ (النجم، ۵۳: ۲)

”تمہیں (اپنی) صحبت سے نوازنے والے (رسول ﷺ جنہوں نے تمہیں اپنا صحابی بنایا) نہ (کبھی) راہ بھولے اور نہ (کبھی) راہ سے بھٹکے۔“

لفظ ضَلَّ بھی دو معنی کا حامل ہے:

۱۔ اس آیت میں ”ضال“ کی نفی کی اور فرمایا: ”ما ضل“، یعنی حضور ﷺ ضال نہیں ہیں۔

۲۔ قرآن مجید میں ایک اور مقام پر ضال کی نسبت حضور ﷺ کی طرف کی ہے۔ فرمایا:

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا (الضحیٰ: ۷) ہم نے آپ کو ضال پایا۔

قرآن مجید کے ترجمہ اور تفسیر کا ایک قاعدہ یہ ہے کہ جب ایک لفظ کے کئی معانی ہوں تو اس لفظ کو اللہ کے لیے استعمال کرتے ہوئے اس معنی کو اختیار کریں جو اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق ہوں اور جب وہ لفظ حضور ﷺ کے لیے استعمال کرنا ہو تو بہت سے معانی میں سے اس معنی کا انتخاب کریں جو حضور ﷺ کی شان کے لیے اعلیٰ وارفع ہو۔ پس وہ معنی جو ہلکا اور کمزور ہو اور حضور نبی اکرم ﷺ کی شان کے لائق نہ ہو اور اس سے حضور نبی اکرم ﷺ کے مقام و مرتبہ میں کسی بھی جہت اور سطح سے کمی یا تنقیص کا اشارہ بھی پایا جائے تو اس معنیٰ کو ترک کر دیا جائے گا۔ اس کو اس مثال سے سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ۔ (آل عمران، ۳: ۵۴)

”پھر (یہودی) کافروں نے (عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کے لیے) خفیہ سازش کی اور اللہ نے (عیسیٰ علیہ السلام کو بچانے کے لیے) مخفی تدبیر فرمائی۔“

اس آیت میں لفظ ”مکر“ کفار کے لیے بھی استعمال ہوا اور اللہ کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ مکر ایک دھوکہ دہی والا منفی عمل ہے۔ کفار نے تو دھوکہ کیا، لہذا اُن کے لیے مکر اور دھوکہ کا معنی ہو گا مگر اللہ تعالیٰ کے لیے اس لفظ کا ترجمہ وہ نہیں کریں گے جو کافروں کے لیے کیا ہے حالانکہ ایک ہی آیت میں وہی لفظ اللہ اور کفار کے لیے الگ الگ استعمال ہوا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس لیے کہ اللہ کی شان کے لائق وہ مکر نہیں، پس اس لفظ کا ترجمہ اللہ کی شان کے مطابق ”خفیہ تدبیر“ کا کریں گے۔

اسی طرح ضال اگر کافروں اور گمراہوں کے لیے آئے تو معنی اور ہے مگر جب حضور نبی اکرم ﷺ کے لیے یہی لفظ آئے گا تو معنی اور ہو گا۔ ماضل صاحبکم وما غوی کے ذریعے درحقیقت اللہ تعالیٰ یہ اعلان فرما رہا ہے کہ تمھیں اپنی صحبت سے نوازنے والے محمد مصطفی ﷺ کو تم مکی، مدنی، عربی اور اس دنیا کا رہنے والا سمجھتے رہے اور یہ سمجھتے رہے کہ یہ صرف علاقائی راستوں کو جاننے والے

ہیں اور صرف اسی دنیا کو جاننے والے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ یہاں کے راستے تو جانتے ہی ہیں مگر جب وہ شبِ معراج سفر پر روانہ ہوئے تو مکہ مکرمہ سے بیت المقدس تک اور بیت المقدس سے آسمانوں تک اور آسمانوں سے سدرۃ المنتہیٰ تک وہ براق پر تھے اور جبرائیل امین اُن کے ہمراہ تھے مگر جب سدرۃ المنتہیٰ پر جبرائیل امین اور براق بھی رک گئے اور اس سے آگے جانے کی ان میں سکت نہ تھی، جہاں عالمِ مکاں ختم ہو گیا تھا اور عالمِ لامکان شروع ہو رہا تھا، وہاں انوار و تجلیات الٰہیہ اس حد تک طاقتور تھیں کہ جبرائیل کا نور بھی ان تجلیات و انوار کو برداشت نہ کر سکتا تھا۔ اس عالمِ لامکان کی بات اللہ تعالیٰ یہاں ارشاد فرما رہا ہے کہ عالمِ مکاں تک تو جبرائیل اور براق ساتھ تھے مگر اب مصطفی تنہا تھے اور وہ سدرۃ المنتہیٰ سے قاب قوسین او ادنیٰ تک گئے۔ یہ عالمِ لامکاں کا سارا سفر تمھارے خیال میں حضور نبی اکرم ﷺ کے لیے پردیس تھا مگر ماضل صاحبکم وما غوی جب مصطفی عالمِ لامکاں میں بھی سفر کرتے ہوئے مجھ تک پہنچے تو نہ راستے بھٹکے اور نہ بھولے۔

سفرِ معراج پر سوال اٹھانے والو یہ دعویٰ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہیں کیا بلکہ یہ اعلان اللہ نے خود فرمایا

بات لامکاں کی فرمائی ہے مگر صاحبکم (تمھارے صاحب) فرما کر ٹائٹل مکانی دیا ہے۔ یہ اسلوب اختیار فرما کر بعض لوگوں کے ذہن میں آنے والے خیالات کی اصلاح فرمائی ہے کہ تم انھیں صرف اپنا ہی صاحب سمجھتے ہو، اسی جہاں کا سمجھتے ہو حالانکہ ان کی شان تو یہ ہے کہ جب وہ اُس جہاں میں آئے جہاں ''جہاں'' ہی نہیں اور اس مکاں میں آئے جو لامکاں ہے تو وہ وہاں نہ راستے بھولے اور نہ ایک لمحہ کے لیے بھی بھٹکے۔ پس جو اس عالمِ لامکاں میں بھی نہ بھولے، وہ اس عالمِ مکاں میں کس طرح بھول اور بھٹک سکتا ہے۔ وہ تمھارے درمیان بے شک ہیں اور تمھیں اپنی صحبت سے بھی نوازتے ہیں مگر حقیقت میں ان کا وطن وہ ہے۔ یہ اسی طرح ہے کہ جب کوئی بندہ مدتوں کے بعد بھی وطن کو جائے تو وہ نہ بھولتا ہے اور نہ بھٹکتا ہے بلکہ سیدھا گھر کو جاتا ہے۔

(۱) ''ضال'' کا معنی محبت بھی ہے

سورہ النجم میں حضور نبی اکرم ﷺ کے بھولنے کی نفی کی اور فرمایا: ماضل صاحبکم (تمھارے

صاحب نہ بھولے) جبکہ دوسری جگہ حضور ﷺ کے بھولنے کا اثبات کیا اور فرمایا:

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا۔ (الضحیٰ:۷)

''ہم نے آپ کو بھولا ہوا پایا۔''

سوال یہ ہے کہ آپ ﷺ کو کس چیز سے بھولا ہوا پایا؟ اس بھولنے سے مراد یہ ہے کہ ہم نے آپ ﷺ کو اپنی محبت میں خود اپنے آپ ہی کو بھولا ہوا پایا۔ یعنی بھولنے کے معنی کی نفی نہیں ہے مگر کس کو بھولنا؟ اس کا تعین حضور نبی اکرم ﷺ کے شان و مرتبہ کے مطابق کرنا ہوگا۔ سیدنا امام جعفر الصادق رضی اللہ عنہ اس کا معنی بیان فرماتے ہیں کہ:

اَی یا محمد وَوَجَدَكَ مُحِبًّا۔

''اے محمد ﷺ ہم نے آپ کو محب پایا۔''

''ضال'' کا لفظ شدید محبت کے لیے استعمال ہوتا ہے اور قرآن مجید سے اس معنی کی تائید بھی ہوتی ہے۔ جب حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی آپ کا قمیص لے کر آئے تاکہ اس کے ذریعے حضرت یعقوب علیہ السلام کی آنکھیں بینا ہو جائیں تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے ان بیٹوں کو دیکھ کر فرمایا کہ مجھے یوسف کی خوشبو آرہی ہے۔ انھوں نے جواب دیا:

اِنَّكَ لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ۔ (یوسف، ۱۲: ۹۵)

'' یقیناً آپ اپنی پرانی ضلال میں ہیں۔''

ائمہ تفسیر نے بالاتفاق واضح کیا ہے کہ اگر یہاں یہ معنی مراد لے لیے جائیں کہ بیٹوں نے یہ کہا ہے کہ آپ اپنی پرانی گمراہی میں ہیں تو اس جملے سے تمام بیٹے کافر ہو جائیں گے۔ اس لیے کہ پیغمبر کو نعوذ باللہ گمراہ کہا۔ چند گمراہ لوگوں نے یہاں معنی ''گمراہی'' کر دیا جبکہ ہدایت یافتہ لوگوں نے ہدایت پر مبنی معنی کیا۔ اس لیے یہاں معنی یہ ہوگا کہ آپ ابھی تک اپنی اسی پرانی محبت میں گرفتار ہیں۔

پس جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ووجدك ضالا تو اس کا معنی یہ ہے کہ ہم نے آپ ﷺ کو اپنی محبت میں شدید گرفتار پایا اور ہم نے آپ کو اپنا محب پایا اور جب اللہ نے حضور ﷺ کو اپنی محبت میں شدید گرفتار پایا تو فرمایا: فھدی، پس ہم نے پردہ اٹھا دیا۔

عربی لغت سے واضح ہے کہ عرب کے صحراؤں اور ریگستانوں میں جہاں مسافروں کو کسی سمت اور جہت کا اندازہ نہ ہو سکے کہ کس طرف جانا ہے اور مشرق و مغرب کس طرف ہے تو وہ وہاں موجود کھجور کے جس لمبے درخت کو دیکھ کر وہ راستے کو پالیتے، اس کو ضال کہتے تھے۔ اس لیے کہ اسے دیکھ کر بھولے ہوئے مسافر لوگ راستہ پالیتے کہ اب یہاں سے ہم نے کس طرف جانا ہے چونکہ کھجور کا

> **ھوٰی کا ایک معنیٰ**
> **خواہش ہے، یہ خواہش**
> **جب شدید ہو جائے تو**
> **محبت کہلاتی ہے**

درخت گم کردہ راہوں اور بھولے بھٹکوں کو راستہ دکھاتا تھا اور ہدایت دیتا تھا، اس لیے سبب بول کر مسبب مراد لیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے استعارہ کی زبان میں فرمایا کہ ووجدك ضالا فھدی؛ میرے مصطفی ﷺ! آپ انسانی زندگی کے صحرائے حیات میں کھجور کے اس درخت کی طرح پیکر ہدایت بن کر کھڑے ہیں اور جو دنیا راستہ بھول گئی تھی، آپ کے سبب سے انھیں راستہ مل گیا۔

اس معنیٰ کی تائید خود حضور نبی اکرم ﷺ کے فرمان سے بھی ہوتی ہے۔ غزوہ حنین کے موقع پر مال غنیمت کی تقسیم کے وقت کچھ لوگوں نے کچھ باتیں کیں۔ جب وہ باتیں حضور ﷺ تک پہنچیں تو ان کے جواب میں حضور ﷺ نے فرمایا: اے لوگو! تم باتیں کرتے ہو حالانکہ:

یا معشر الانصار الم اجدکم ضلالاً فھداکم اللہ بی و کنتم متفرقین فالفکم اللہ بی و عالۃ فاغناکم اللہ بی۔ (صحیح بخاری، کتاب المغازی باب غزوۃ الطائف)

”اے انصار کے لوگو! کیا تم گمراہ نہیں تھے، پھر اللہ نے میرے ذریعے تمہاری ہدایت فرمائی۔ کیا تم بٹے ہوئے نہیں تھے، پھر اللہ نے میرے ذریعے تم کو باہم متحد کیا۔ کیا تم فقیر تنگدست نہیں تھے، پھر اللہ نے میرے ذریعے تم کو مالدار بنایا۔“

گویا اس حدیث مبارک میں حضور نبی اکرم ﷺ نے سورۃ الضحیٰ کے الفاظ کی وضاحت فرمادی۔

(۲) محبت کی دو خصوصیات

ماضل صاحبکم وماغوی کے فرمان میں اللہ تعالیٰ نے لفظ ضل کیوں استعمال فرمایا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ محبت کی دو خوبیاں ہیں:

۱۔ اگر کسی سے محبت ہو جائے تو محبت، محبت کرنے والے کا ارادہ مٹا دیتی ہے اور ارادہ محبوب کے ارادے میں گم ہو جاتا ہے۔

۲۔ محبت کی دوسری خوبی یہ ہے کہ محبت بھلانے لگ جاتی ہے۔ یعنی محبت ہو جائے تو حافظے پر اثر پڑتا ہے۔ محبت سے بندے کو نسیان ہو جاتا ہے۔ بندہ غیر کو بھولنے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے

ہمارا نام انسان رکھا۔ لفظ انسان پر ائمہ لغت نے دو اقوال بیان کیے ہیں:

۱۔ لفظ ''انسان'' میں پہلا حرف الف ہے۔ اگر یہاں الف زائدہ ہے تو پھر یہ لفظ ''نسیان'' (بھولنا) سے نکلا ہے۔

۲۔ اگر لفظ انسان کا الف زائدہ نہ ہو بلکہ اصلیہ ہو تو پھر یہ ''انس'' (محبت) سے نکلا ہے۔

پس بعض کے نزدیک لفظِ انسان کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ چونکہ بھولنا اس کی فطرت میں ہے، اس لیے اسے انسان کہتے ہیں اور بعض کے نزدیک چونکہ انس و محبت کرنا اس کی فطرت میں ہے، اس لیے اسے انسان کہتے ہیں۔ میں ان دونوں اقوال کو الگ الگ تسلیم کرنے کے بجائے ایک ہی قول کے دو رخ قرار دیتا ہوں۔ یہ ایک ہی حقیقت ہے۔ انسان بیک وقت ''نسیان'' اور ''انس'' سے ہے۔ انسان میں یہ دونوں چیزیں ہیں۔ یہ محبت کرنے والا بھی ہے اور بھولنے والا بھی ہے۔ محبت کرنا اور بھولنا، ان دونوں کا تعلق یہ ہے کہ جب محبت سچی اور شدید ہو جائے تو صرف محبوب یاد رہتا ہے اور محبوب کے علاوہ باقی ہر شے بھول جاتی ہے۔ محبت کامل ہی تب رہتی ہے کہ جب محبوب یاد رہے اور محبوب کا غیر بھول جائے۔ گویا جب انس و محبت اس مقام پر جا پہنچے کہ غیر بھول جائے تو انسان؛ انسان بن جاتا ہے۔ جس طرح محبت ارادے کو ختم کرتی ہے اور محبوب کا ارادہ غالب آجاتا ہے، اسی طرح محبت کا دوسرا اثر یہ ہوتا ہے کہ یہ نسیان پیدا کرتی ہے۔

سفرِ معراج، روحانی معراج کا تیسرا مرحلہ معرفت سے تجرید تک کا سفر ہے

جب سوائے محبوب کے سب بھول جائے اور بھولنے کی کیفیت غالب آجائے تو انسان راستہ بھی بھول جاتا ہے مگر اللہ نے فرمایا کہ میرے محبوب کو مجھ سے شدید محبت ہوئی اور کمال پر پہنچی اور اس محبت نے اپنا یہ اثر دکھایا کہ میرے محبوب کا ارادہ میرے ارادے میں فنا کر دیا، مگر محبت کا دوسرا اثر کہ یہ بھلا دیتی ہے، میرے محبوب کی محبت کا کمال یہ ہے کہ محبت شدید بھی رہی مگر کہیں بھولنے بھی نہ پائی۔ جب محبت شدید ہو تو بندہ چلتے چلتے راستے سو بار بھول جاتا ہے، بات کرتے کرتے بھول جاتا ہے اور پھر پوچھتا ہے کہ میں کیا کہہ رہا تھا، اس لیے کہ جب دھیان ایک طرف لگا ہو تو راستے اور باتیں بھول جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اذا ھوی میرے محبوب کو شدید محبت ہوئی مگر ماضل؛ یہ شدید محبت

میرے محبوب کو بھلا نہ سکی اور محبوب میری طرف چلا اور ایسا چلا کہ محبت کا جوش بھی تھا اور معرفت حق کا ہوش بھی تھا۔

بہت سے لوگوں پر جب محبت غالب آجاتی ہے تو وہ بھول جاتے ہیں، بہت سی باتیں ان سے صادر ہوتی ہیں، منہ سے شطحیات نکلتی ہیں، نتیجتاً ان پر فتوے لگ جاتے ہیں، حتی کہ اس سبب وہ حلاج کی طرح پھانسی چڑھ جاتے ہیں، مگر آپ ﷺ کی اللہ سے محبت پر قربان جائیں کہ محبت شدید ہوئی مگر کمال یہ ہے کہ بھولے بھی نہیں۔

حضور نبی اکرم ﷺ نے ایک مرتبہ نماز عصر دو رکعت پڑھانے کے بعد سلام پھیر دیا۔ ایک صحابی نے پوچھا:

یا رسول اللہ ﷺ! أَنَسِيتَ أَمْ قَصُرَتِ الصَّلَاةُ

کیا آپ بھول گے ہیں یا نماز آدھی کر دی گئی ہے؟

آقا علیہ السلام نے فرمایا:

لَمْ أَنْسَ وَلَمْ تُقْصَرْ۔

”نہ میں بھولا ہوں اور نہ نماز چھوٹی کی گئی ہے۔“

(بخاری، الصحیح، باب: من یکبر فی سجدتی السہو، ۱: ۴۱۲، الرقم: ۱۱۷۲)

دوسری روایت میں ہے کہ صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ اگر آپ نہیں بھولے تو پھر کیا ہوا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ: انی لأنسی أو أنسی لأسن.

(موطا مالک، ۱: ۱۰۰، الرقم: ۲۲۵)

جب دیکھتے ہو کہ میں بھولا ہوں تو یاد رکھ لو کہ میں بھلایا گیا ہوں اور میں بھلایا اِس لیے جاتا ہوں تاکہ میرا ہر فعل تمہارے لیے سنت بن جائے۔ یعنی تمھیں معلوم ہو جائے کہ بھولنے کی صورت میں سجدہ سہو کیسے کرنا ہے۔

جب یہ فرمایا کہ بھلایا گیا ہوں تو اس سے واضح ہو رہا ہے کہ بھلانے کا ارادہ حضور ﷺ کا نہیں بلکہ اللہ کا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو نسیان کی نسبت بھی حضور ﷺ کی طرف نہیں کی اور لوگ نعوذ باللہ اس سے بھی بڑی چیزوں کی نسبت حضور ﷺ کی طرف کرتے ہیں۔ حضور ﷺ نے بھی صراحت سے اپنی ذات کے ساتھ بھولنے کی نفی فرمادی۔ جس نسیان کی حضور ﷺ اپنی ذات سے خود نفی فرمادیں تو اب کوئی کیسے حضور ﷺ کی طرف نسیان کو منسوب کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ما ضل صاحبکم فرما کر اس نسیان کی نفی فرمادی اور واضح کر دیا کہ میرا محبوب کبھی نہیں بھولا۔

حضرت آدم علیہ السلام نے جب جنت میں پھل کھایا تو ان سے اللہ نے گناہ کی نفی کی۔ فرمایا:

فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا۔ (طٰہٰ، ۲۰: ۱۱۵)

”سو وہ بھول گئے اور ہم نے ان میں بالکل (نافرمانی کا کوئی) ارادہ نہیں پایا (یہ محض ایک بھول تھی)۔“

جب نافرمانی کا ارادہ نہ پایا تو گناہ نہ رہا اور جب گناہ نہ رہا تو آدم علیہ السلام گناہگار نہ ہوئے اور اللہ نے آدم علیہ السلام کی بے گناہی کا اعلان خود فرمادیا اور آدم علیہ السلام کے پھل کھانے کے اس عمل کو بھول جانا قرار دیا۔ معلوم ہوا کہ بھولنا کوئی اتنا بڑا جرم نہیں۔ ہم بھول کر کھانا کھالیں تو روزہ بھی نہیں ٹوٹتا اور اگر آدم علیہ السلام بھول کر پھل کھالیں تو کیا اس سے ان کی بندگی ٹوٹ جائے گی؟

جب قرب کی وادی میں بلایا جاتا ہے تو کامل تجرید و انقطاع کے بغیر قرب نہیں دیا جاتا

سمجھانا یہ مقصود ہے کہ نسیان (بھولنا) ایک چھوٹا سا عمل ہے جس میں نافرمانی اور گناہ نہیں ہے۔ اللہ نے آدم علیہ السلام کے بارے میں فرمایا کہ وہ بھول گئے مگر جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی باری آئی تو اس چھوٹے سے عمل کی نسبت بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف نہ کی بلکہ فرمایا: ماضل میرے محبوب نہیں بھولے۔

پس معلوم ہوا کہ محبت بھلاتی ہے مگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پورا سفر معراج کیا اور کہیں بھولے بھی نہیں۔ یہ محبت سے معرفت تک کا مرحلہ ہے۔ یعنی ہر وقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معرفت کے ساتھ رہے اور کبھی نہیں بھولے۔

۳۔ معرفت سے تجرید تک کا سفر

سفر معراج میں روحانی معراج کا تیسرا مرحلہ ”معرفت سے تجرید تک کا سفر“ ہے۔ یہ مرحلہ قرآن مجید کی اس آیت مبارکہ کی روشنی سے واضح ہو رہا ہے۔ ارشاد فرمایا:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى۔ (النجم، ۵۳: ۳)

”اور وہ (اپنی) خواہش سے کلام نہیں کرتے۔“

حضور ﷺ اپنی خواہش سے بولتے ہی نہیں ہیں۔ آقا ﷺ کے عمل اور فعل حتی کہ بولنے میں بھی خواہش کی نفی کر دی۔ یہ معرفت سے تجرید تک کا سفر ہے۔ تجرید کا معنی انقطاع ہے۔ اس سفر میں اپنی خواہش، اپنی ذات الغرض ہر چیز سے مکمل انقطاع کروایا گیا۔ فرمایا کہ حضور ﷺ جو بولتے ہیں، اس میں آپ ﷺ کی خواہش کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔

یاد رکھیں! جب قرب کی وادی میں بلایا جاتا ہے تو کامل تجرید و انقطاع کے بغیر قرب نہیں دیا جاتا۔ موسیٰ علیہ السلام کو بھی تجرید و انقطاع کے مرحلہ سے گزارا گیا مگر اس تجرید اور حضور ﷺ کی تجرید میں واضح فرق ہے۔ موسیٰ علیہ السلام جب وادی سے گزرے تو انھوں نے وہاں ایک آگ دیکھی۔ انہوں نے اپنے گھر والوں سے کہا تم یہاں ٹھہرے رہو، میں نے ایک آگ دیکھی ہے، شاید میں اس میں سے کوئی چنگاری تمہارے لیے بھی لے آؤں۔ پھر جب وہ اس آگ کے پاس پہنچے تو آواز آئی کہ اے موسیٰ! بے شک میں ہی تمہارا رب ہوں:

فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى۔ (طٰہٰ: ۱۲)

”سو تم اپنے جوتے اتار دو، بے شک تم طویٰ کی مقدس وادی میں ہو۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس مقدس وادی میں سب سے پہلے تجرید و انقطاع کا حکم دیا گیا کہ میری قرب کی وادی اور میرے حضور میں آنے کے لیے ہر چیز سے انقطاع ضروری ہے۔ اس تجرید اور انقطاع کے لیے فرمایا کہ اپنے جوتے اتار دیں۔ جوتے اتارنے کا یہ حکم اس امر کی طرف اشارہ تھا کہ اپنے ہونے کا، اپنی چاہت، اپنی خواہش، اپنی شخصیت اور اپنے نفس کا لباس اتار دیں۔ اس لیے کہ یہ غیریت ہے۔ تم میرے حضور میں آرہے ہو اور حاضری کے لیے غیریت کی ہر شے چھوڑ کر آتے ہیں۔

اب مقام موسوی علیہ السلام اور مقام محمدی ﷺ کا فرق سمجھیں کہ موسیٰ علیہ السلام سے تجرید و انقطاع تو اسی وادی میں کروا دیا تھا اور حکم دیا تھا کہ ہر شے کو چھوڑ کر آ مگر جب حضور ﷺ کو بلایا تو مسجد حرام سے لے کر قاب قوسین او ادنیٰ تک پورے سفر میں ایک مقام بھی نہیں ملتا کہ جہاں اللہ نے آپ ﷺ کو تجرید و انقطاع کا حکم دیا ہو بلکہ حضور ﷺ کی شان کو بیان فرمایا کہ وما ینطق عن الھوی، ان کی تو اپنی خواہش ہے ہی نہیں، یہ جب بھی بولتے ہیں، مجھ سے بولتے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کو تجرید کا حکم دیا جا رہا ہے جبکہ حضور ﷺ کی شانِ تجرید کو بیان فرمایا جا رہا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب وادی میں نور نظر آیا تب تجرید و انقطاع کروایا جبکہ حضور ﷺ نے غیریت، علائقِ بشریت اور علائقِ مادیت کا لباس کب سے چھوڑ رکھا ہے؟ اس کا تو کسی کو معلوم ہی نہیں ہے۔ گویا جو بات موسیٰ علیہ السلام کو بتائی جا رہی ہے، مصطفی ﷺ سفر پر روانہ ہونے سے قبل ہی اس مقام

پر ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کو تو ظاہری لباس اور علائقِ دنیوی کی تجرید کا کہا جبکہ خواہش کا تعلق تو باطن سے ہوتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام سے ابھی ظاہر کا تعلق چھڑوایا جا رہا ہے، اگلے مرحلے میں باطنی علائق سے انقطاع کروایا جائے گا جبکہ حضور ﷺ کے لیے خود اعلان فرمادیا کہ ظاہری علائق تو بڑی دور کی بات وما ینطق عن الھوی کے مصداق حضور ﷺ میں تو باطنی علائق بھی موجود نہیں ہیں۔

۴۔ تجرید سے تفرید تک کا سفر

اس تجرید کے بعد پھر اگلا مرحلہ شروع ہوتا ہے جو تجرید سے تفرید تک کا سفر ہے۔ تفرید کا معنی مکمل علیحدگی ہے۔ انقطاع جب شروع ہو تو اسے تجرید کہتے ہیں اور جب انقطاع کامل ہو جائے تو اسے تفرید کہتے ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب حضور ﷺ اپنی خواہش سے نہیں بولتے تو حضور ﷺ کا بولنا کیا ہے؟ فرمایا: اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی۔ (النجم، ۵۳: ۴)

"اُن کا ارشاد سَراسَر وحی ہوتا ہے جو انہیں کی جاتی ہے۔"

یعنی وہ ایک لفظ بھی اپنی مرضی اور خواہش سے نہیں بولتے بلکہ ایک لفظ بھی جو آپ ﷺ کی زبان مبارک سے ادا ہوتا ہے، وہ اللہ کی وحی ہوتی ہے۔ گویا حضور ﷺ کی زبان زبانِ وحی ہے۔ اگر وہ الفاظ کی صورت میں آئی ہو تو اسے قرآن کہتے ہیں اور اگر معناً آئی ہو تو اسے حدیث کہتے ہیں۔

جب تفرید ہو جائے تو "بودہ او بودہ اللہ بود" کے مصداق زبان سے جو لفظ بھی نکلتا ہے وہ کلامِ خدا ہوتا ہے اور ہر فعل جو حضور ﷺ سے صادر ہوتا ہے، وہ فعل بھی حضور ﷺ کی اپنی خواہش سے روبہ عمل نہیں آتا۔ جب حضور نبی اکرم ﷺ کا کلام اور فعل وحی خدا ہوا تو آپ ﷺ کا ہر کلام اور فعل ہر ایک نقص سے پاک ہوا۔ اب حضور ﷺ کی طرف کوئی نقص منسوب نہ رہا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کی شخصیت سے ہر اُس چیز کو علیحدہ کر دیا ہے جس سے کوئی خطا اور نقص ہو سکتا تھا یا خطا اور نقص کا امکان بھی ہو سکتا تھا۔

اس طرح اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ہر ایک ظاہری و باطنی علائقِ بشری سے جدا کر کے نکھارا اور سنوارا اور اس سفر معراج میں اِن تمام روحانی اسفار اور مراحل سے گزارا اور بالآخر اپنی زیارت اور ملاقات کا شرف عطا فرمایا۔

(خطاب نمبر: En-50)، (مورخہ: 31 اگست 2005ء)، (برطانیہ)

دارالافتاء تحریک منہاج القرآن، زیرنگرانی: مفتی عبدالقیوم خان ہزاروی

سوال: کیا پینٹ شرٹ میں امامت کرانا درست ہے؟

جواب: قرآنِ مجید میں اللہ پاک کا ارشاد ہے:

یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْکُمْ لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوْاٰتِکُمْ وَرِیْشًا وَلِبَاسُ التَّقْوٰی ذٰلِکَ خَیْرٌ ذٰلِکَ مِنْ اٰیٰتِ اللّٰہِ لَعَلَّھُمْ یَذَّکَّرُوْنَ۔

اے اولادِ آدم! بے شک ہم نے تمہارے لیے (ایسا) لباس اتارا ہے جو تمہاری شرمگاہوں کو چھپائے اور (تمہیں) زینت بخشے اور (اس ظاہری لباس کے ساتھ ایک باطنی لباس بھی اتارا ہے اور وہی) تقویٰ کا لباس ہی بہتر ہے۔ یہ (ظاہر و باطن کے لباس سب) اللہ کی نشانیاں ہیں تاکہ وہ نصیحت قبول کریں۔(الاعراف:۲۶)

سورہ الاعراف کی ہی ایک اور آیت میں مزید فرمایا:

یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ وَّکُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ. (الاعراف:۳۱)

اے اولادِ آدم! تم ہر نماز کے وقت اپنا لباسِ زینت (پہن) لیا کرو اور کھاؤ اور پیو اور حد سے زیادہ خرچ نہ کرو کہ بیشک وہ بے جا خرچ کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔

سورہ النحل میں فرمایا:

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا وَّجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَاْسَكُمْ كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ۔

اور اللہ ہی نے تمہارے لئے اپنی پیدا کردہ کئی چیزوں کے سائے بنائے اور اس نے تمہارے لئے پہاڑوں میں پناہ گاہیں بنائیں اور اس نے تمہارے لئے (کچھ) ایسے لباس بنائے جو تمہیں گرمی سے بچاتے ہیں اور (کچھ) ایسے لباس جو تمہیں شدید جنگ میں (دشمن کے وار سے) بچاتے ہیں، اس طرح اللہ تم پر اپنی نعمتِ (کفالت و حفاظت) پوری فرماتا ہے تاکہ تم (اس کے حضور) سرِ نیاز خم کر دو۔ (النحل: ۸۱)

ان آیات میں لباس کے تین اہم بنیادی اصول بیان کیے گئے ہیں:

۱۔ ستر پوشی ۲۔ زیب و زینت کا حصول

۳۔ موسمی شدت سے بچاؤ

اس لیے ہر وہ لباس جو انسان کی ستر پوشی کرے، پہنا ہوا خوبصورت لگے اور گرم و سرد موسم کی شدت سے بچائے، شرعاً جائز ہے، اور اگر کوئی دوسری شرعی ممانعت اس سے ملحق نہ ہو تو اسے پہن کر نماز ادا کرنا، جماعت کروانا بھی درست ہے۔

کسی لباس کو صرف اس بنا پر ترک نہیں کیا جاسکتا کہ غیر مسلم بھی ایسا لباس پہنتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ و سلم نے وہی لباس زیبِ تن کیے جو عرب معاشرت میں مروج تھے، وہی لباس بدترین کفار، یہود و نصاریٰ بھی پہنتے تھے۔ حرمت و حلت کے احکام کے ساتھ وہی جبہ و دستار، وہی پاپوش، وہی خورد و نوش، وہی سواری کے جانور، وہی جنگی اوزار آپ ﷺ کے ہاں بھی مستعمل تھے جو دیگر مذاہب کے ماننے والے استعمال کرتے تھے۔ اس لیے کہ غیر مسلموں کی مشابہت کے خوف سے ضرورت کی اشیاء کو ترک نہیں کیا جاسکتا۔ صرف ان امور میں ان کی مشابہت مذموم ہے جو شرعاً ناجائز ہوں۔ جیسے امام ابنِ نجیم فرماتے ہیں:

اِعْلَمْ أَنَّ التَّشَبُّهَ بِأَهْلِ الْكِتَابِ لَا يُكْرَهُ فِي كُلِّ شَيْءٍ فَإِنَّا نَأْكُلُ وَنَشْرَبُ كَمَا يَفْعَلُونَ إِنَّمَا الْحَرَامُ هُوَ التَّشَبُّهُ فِيمَا كَانَ مَذْمُومًا وَفِيمَا يُقْصَدُ بِهِ التَّشَبُّهُ كَذَا ذَكَرَهُ قَاضِيخَانْ فِي شَرْحِ الْجَامِعِ الصَّغِيرِ.

جان لو کہ اہلِ کتاب کے ساتھ ہر چیز میں مشابہت مکروہ نہیں ہے، کیونکہ ہم بھی کھاتے پیتے ہیں جس طرح وہ کھاتے ہیں۔ صرف ان امور میں مشابہت ممنوع ہے جو شرعاً مذموم ہیں، یا جس کام کو ان کے ساتھ مشابہت کے ارادے سے کیا جائے، وہ ممنوع ہے۔ یہی قاضی خان نے جامع الصغیر کی شرح میں ذکر کیا ہے۔ (ابن نجیم، البحر الرائق، ۲: ۱۱)

اور علامہ حصکفی کے مطابق:

فَإِنَّ التَّشَبُّهَ بِهِمْ لَا يُكْرَهُ فِي كُلِّ شَيْءٍ، بَلْ فِي الْمَذْمُومِ وَفِيمَا يُقْصَدُ بِهِ التَّشَبُّهُ. (حصكفي، الدر المختار، ۱: ۶۲۴)

اہلِ کتاب کے ساتھ ہر چیز میں مشابہت مکروہ نہیں ہے، بلکہ مذموم چیزوں میں مشابہت مکروہ ہے یا وہ کام جس کے ذریعے ان جیسا بننے کی کوشش کی جائے۔

پینٹ شرٹ اگرچہ مغربی اقوام کا لباس ہے مگر دورِ حاضر میں یہ مذہبی لباس نہیں رہا۔ سکول و کالج سے لیکر دفاتر تک بلا تفریقِ مذہب یہ پہنا جاتا ہے، اس لیے یہ کہہ کر کسی کو جماعت سے روکنا درست نہیں کہ اس نے غیر مسلموں کا لباس پہن رکھا ہے۔ البتہ پینٹ شرٹ ڈھیلی ڈھالی ہونی چاہیے، ایسی چست و تنگ نہ ہو کہ جس میں جسمانی اعضاء کے خدوخال ظاہر ہو رہے ہوں۔

یہ درست ہے کہ لباس ستر پوشی، موسمی شدت سے بچاؤ اور زیب و زینت کے ساتھ تہذیب و تمدن کا بھی اظہار کرتا ہے۔ اسلام کے اولین مخاطب عربوں سمیت تمام مشرقی تہذیبوں میں ڈھیلا ڈھالا لباس ہی پہنا گیا اور چست لباس کو ناپسند کیا گیا۔ قمیص، تہبند اور شلوار ہند تہذیب کا حصہ ہیں مگر فقہائے برصغیر نے ان کو قبول کیا کیونکہ یہ ایسا لباس نہیں تھے جس سے اعضائے جسمانی کا اظہار ہو۔ چست و تنگ لباس کا تعلق ہماری تہذیب سے نہیں ہے۔ پینٹ شرٹ بھی اگر ڈھیلی ڈھالی ہے اور ستر پوشی کرتی ہے تو اس میں نماز پڑھنے یا جماعت کروانے میں حرج نہیں۔

سوال: بیوی کی تادیبِ جسمانی کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

جواب: اسلامی نظامِ معاشرت میں گھر کی مثال ایک چھوٹی سی ریاست کی ہے جس کی سربراہی قدرت اور فطرت نے شوہر کو سونپی ہے' بیوی اس ریاست میں شوہر کی معاون اور اس کے مال و آبرو کی محافظ ہے۔ اگر کسی موقع پر بیوی کے رویے میں ایسا بگاڑ آجائے کہ اس سے 'ریاستِ خاندانی' کی ٹوٹ پھوٹ کا اندیشہ پیدا ہو جائے تو ازدواجی زندگی بچانے کی خاطر قرآنِ حکیم نے شوہر کے لیے چند اقدامات اور تدابیر تجویز کی ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں قرآنِ مجید کا ارشاد ہے:

اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا (النساء، ۴: ۳۴)

مرد عورتوں پر محافظ و منتظم ہیں اس لئے کہ اللہ نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اور اس وجہ سے (بھی) کہ مرد (ان پر) اپنے مال خرچ کرتے ہیں، پس نیک بیویاں اطاعت شعار ہوتی ہیں شوہروں کی عدم موجودگی میں اللہ کی حفاظت کے ساتھ (اپنی عزت کی) حفاظت کرنے والی ہوتی ہیں۔

اور تمہیں جن عورتوں کی نافرمانی و سرکشی کا اندیشہ ہو تو اُنہیں نصیحت کرو اور (اگر نہ سمجھیں تو) اُنہیں خواب گاہوں میں (خود سے) علیحدہ کر دو اور (اگر پھر بھی اِصلاح پذیر نہ ہوں تو) اُن سے (تادیباً) عارضی طور پر الگ ہو جاؤ؛ پھر اگر وہ (رضائے الٰہی کے لیے) تمہارے ساتھ تعاون کرنے لگیں تو ان کے خلاف کوئی راستہ تلاش نہ کرو۔ بیشک اللہ سب سے بلند سب سے بڑا ہے۔

اس آیتِ مبارکہ میں بیوی کی سرکشی عملاً واقع ہونے یا اس کے اندیشے کے پیشِ نظر شوہر سے کہا گیا ہے کہ اولاً بیوی کو سمجھائے، اگر سمجھانے بجھانے سے اس کی سرکشی ختم نہ ہو تو دوسری تدبیر اختیار کرتے ہوئے اس کا بستر الگ کر دے اور اس سے عملِ مباشرت روک دے۔ اگر ان دونوں اقدامات سے بھی سرکشی کا سدِ باب نہ ہو تو تادیباً اس سے علیحدگی اختیار کر لی جائے تاکہ اسے اپنی غلطی کا احساس ہو۔ یہ اس کی آخری اور حتمی سزا ہے۔ لفظ 'وَاضْرِبُوْهُنَّ' سے یہاں مراد بیوی کو سزا کے طور پر الگ کرنا ہے۔ اگر یہ تمام تدابیر اختیار کرنے کے بعد بھی مسئلہ حل نہ ہو پائے تو اگلی آیتِ مبارکہ میں فرمایا گیا ہے:

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا (النساء، ۴: ۳۵)

اور اگر تمہیں ان دونوں کے درمیان مخالفت کا اندیشہ ہو تو تم ایک مُنصِف مرد کے خاندان سے اور ایک مُنصِف عورت کے خاندان سے مقرر کر لو، اگر وہ دونوں (مُنصِف) صلح کرانے کا اِرادہ رکھیں تو اللہ ان دونوں کے درمیان موافقت پیدا فرما دے گا، بیشک اللہ خوب جاننے والا خبردار ہے۔

یعنی شوہر کے تمام تدابیر کارگر ثابت نہ ہونے پر میاں بیوی کی ازدواجی زندگی بچانے کے لیے دونوں خاندانوں کے لوگ ان کے درمیان الجھاؤ ختم کرنے کی کوشش کریں۔ اگر یہ کوشش بھی بیکار رہے اور میاں بیوی کی نفرت خود کو یا دوسرے کو ہلاک کرنے تک پہنچ جائے تو مار پیٹ کرنے اور تشدد کا راستہ اپنانے کی بجائے آخری قدم کے طور پر شوہر بیوی کو ایک طلاقِ رجعی دے۔ اگر دورانِ عدت معاملات درست ہو جائیں تو ٹھیک ورنہ طلاق کی عدت مکمل ہونے پر ان کا نکاح ختم ہو جائے گا اور بیوی کسی دوسرے مرد سے نکاح کرنے میں آزاد ہو گی۔

خاندان چلانے اور بچانے کا یہی مہذب اور درست طریقہ ہے، مار پیٹ، تشدد اور گالم گلوچ کی نہ فطرت اجازت دیتی ہے اور نہ اسلام اس کا حکم دیتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن زمعہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

لَا يَجْلِدُ أَحَدُكُمُ امْرَأَتَهُ ثُمَّ يُجَامِعُهَا فِي آخِرِ الْيَوْمِ.

تم میں سے کوئی شخص اپنی بیوی کو نہ پیٹے کہ پھر دن ختم ہو تو اس سے مجامعت کرنے بیٹھ جائے۔(بخاري، الصحیح، کتاب النکاح، باب مایکرہ من ضرب النساء وقول اللہ (واضربوھن) أي ضربا غیر مبرح، ۵: ۱۹۹۷، رقم: ۴۹۰۸)

اور حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ ایک طویل حدیث مبارکہ روایت کرتے ہیں جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خطبہ حجۃ الوداع بیان کیا گیا ہے۔اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

فَاتَّقُوا اللهَ فِي النِّسَاءِ، فَإِنَّكُمْ أَخَذْتُمُوهُنَّ بِأَمَانِ اللهِ، وَاسْتَحْلَلْتُمْ فُرُوجَهُنَّ بِكَلِمَةِ اللهِ، وَلَكُمْ عَلَيْهِنَّ أَنْ لَا يُوطِئْنَ فُرُشَكُمْ أَحَدًا تَكْرَهُونَهُ، فَإِنْ فَعَلْنَ ذَلِكَ فَاضْرِبُوهُنَّ ضَرْبًا غَيْرَ مُبَرِّحٍ، وَلَهُنَّ عَلَيْكُمْ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ.

تم لوگ عورتوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو، کیونکہ تم لوگوں نے ان کو اللہ تعالیٰ کی امان میں لیا ہے، تم نے اللہ تعالیٰ کے کلمہ (نکاح) سے ان کی شرمگاہوں کو اپنے اوپر حلال کر لیا ہے، تمہارا ان پر حق یہ ہے کہ وہ تمہارے بستر پر کسی ایسے شخص کو نہ آنے دیں جس کا آنا تمہیں ناگوار ہو، اگر وہ ایسا کریں تو تم ان کو اس پر ایسی سزا دو جس سے چوٹ نہ لگے! اور ان کا تم پر یہ حق ہے کہ تم اپنی حیثیت کے مطابق ان کو خوراک اور لباس فراہم کرو۔

(مسلم، الصحیح، کتاب الحج، باب حجۃ النبي، ۲: ۸۸۹-۸۹۰، رقم: ۱۲۱۸)

درج بالا آیات و روایات سے واضح ہوتا ہے کہ بیویوں پر تشدد کا نہ حکم ہے اور نہ یہ عمل پسندیدہ ہے۔بیوی کی سرکشی کی صورت میں مار کے علاوہ دیگر تدابیر اختیار کرنا ہی مشروع و مندوب ہے۔

تربیتِ اولاد: اسوۂ مصطفیٰ ﷺ کی روشنی میں

گزشتہ سے پیوستہ

ڈاکٹر حسن محی الدین قادری (چیئرمین سپریم کونسل منہاج القرآن انٹرنیشنل)

بارگاہ مصطفیٰ ﷺ سے تربیتِ اولاد کا جو لائحہ عمل میسر آتا ہے، کائنات کی کوئی شخصیت اس سے بہترین لائحہ عمل عطا نہیں کر سکتی۔ تربیتِ اولاد کے تناظر میں شاید ہی کوئی پہلو ایسا ہو جس کی طرف آقا ﷺ نے خود رہنمائی نہ فرما دی ہو۔ آپ ﷺ نے اس سلسلہ میں اپنا اسوۂ حسنہ عطا فرمایا کہ بچوں کے ساتھ جو رویہ اور سلوک مجھے اپناتا ہوا دیکھو، اس کی پیروی کرو۔ جس طرح حضور علیہ السلام کو اپنے دور کے بچوں کی فکر تھی، اسی طرح قیامت تک آنے والی نسلوں اور اولادوں کی فکر بھی آپ ﷺ کو دامن گیر تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے متعدد فرامین کے ذریعے والدین اور معاشرے کو بچوں کی تعلیم و تربیت کی طرف متوجہ فرمایا۔ ذیل میں اس سلسلہ میں آپ ﷺ کے چند فرامین درج کیے جاتے ہیں:

۱۔ اولاد کو محبتِ رسول، محبتِ اہلِ بیتِ اطہار اور قرأت القرآن سکھانے کی نصیحت

آقا ﷺ نے فرمایا:

أدبوا أولادكم على ثلاث خصال حب نبيكم وحب أهل بيته وقراءة القرآن۔

(هندي، كنز العمال، ١٦ : ١٨٩، الرقم: ٤٥٤٠٩)

اپنی اولاد کو تین خصلتیں سکھاؤ: اپنے حبیب مکرم ﷺ کی محبت، اہل بیت اطہار کی محبت اور قرأت القرآن۔

اِس کا مطلب ہے کہ محبت ایک ایسی چیز ہے جو پڑھنے سے نہیں آتی بلکہ عمل کر کے سکھائی جاتی ہے۔ آج یہ ایک بہت بڑا چیلنج ہے جس سے ہمیں نبرد آزما ہونا ہوگا اور اپنی اولاد اور نئی نسل کو محبتِ مصطفی ﷺ اور محبتِ اہلِ بیتِ اطہار کے جام پلانے ہوں گے اور قرآن مجید سے محبت اور اس کی تعلیمات پر عمل کی ترغیب دینا ہوگی۔

۲۔ اولاد کی تکریم کا حکم

آقا ﷺ نے فرمایا:

أکرموا أولادکم وأحسنوا أدبهم.

''اپنی اولاد کی تکریم کرو اور انھیں اچھے آداب سکھاؤ۔''

(ابن ماجه، السنن، کتاب الأدب، ۲: ۱۲۱۱، الرقم: ۳۶۷۱)

آقا ﷺ حکم دے رہے ہیں کہ اپنی اولاد کی عزت کرو جبکہ ہم آج تک صرف یہی سیکھتے آئے ہیں کہ بڑوں کا اکرام کرو۔ آقا ﷺ نے بڑوں کے علاوہ بچوں کی بھی عزت کرنے کی طرف رہنمائی فرمائی۔ اس فرمان سے سمجھانا یہ مقصود ہے کہ جو اپنی اولادوں کی عزت نہیں کرتا، کل اُن کی اولاد بھی کسی کی عزت نہیں کرے گی۔ آقا علیہ السلام نے تصور ہی تبدیل فرما دیا اور واضح کر دیا کہ اگر اولاد کو عزت کرنے والا بنانا ہے تو پہلے اولاد کو عزت دو۔ یعنی پہلے اولاد کو عزت کے ساتھ بٹھاؤ، اُن کو اچھے الفاظ اور القاب کے ساتھ بلاؤ۔ اُنہیں صاحب اور بھائی کہہ کر بلانے سے ہماری عزت بڑھے گی، کم نہیں ہوگی۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم فرمایا اپنی اولاد کی تکریم کرو اور اُنہیں اچھے آداب سکھاؤ

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری اپنے صاحبزادوں، پوتوں اور نواسوں کو بھائی جبکہ اپنی صاحبزادیوں، نواسیوں اور پوتیوں کو باجی کہہ کر پکارتے ہیں۔ یہ حکمت ہے، اس لیے کہ آج انھیں

عزت دی جائے گی تو کل وہ عزت دینے والے بنیں گے اور انھیں احساس ہو گا کہ ہمیں بھی اِتنے ہی عزت بھرے القاب سے بلایا جاتا تھا، لہذا ہم بھی ایسا ہی کریں۔

۳۔ تربیت کرنے میں جھجک اور شرم محسوس نہ کرنے کی ہدایت

آقا ﷺ نے فرمایا: إنما أنا لكم مثل الوالد أعلمكم۔

(أحمد بن حنبل، المسند، ۲: ۲۵۰، الرقم: ۷۴۰۳)

”میں تمہارے لیے ایسے ہوں جیسے والد اپنی اولاد کے لیے ہوتا ہے، میں تمھیں سکھاتا ہوں۔“

یعنی جس طرح والد اپنی اولاد کو سکھاتا ہے، میں بھی تمھیں اسی طرح سکھاتا اور تعلیم دیتا ہوں۔ اسی روایت میں ہے کہ آقا ﷺ نے روزمرہ معمول کے حوالے سے چھوٹی سی چھوٹی چیز کے متعلق تعلیم و تربیت فرمائی حتی کہ قضائے حاجت کے لیے واش روم جانے اور اٹھنے بیٹھنے کے حوالے سے بھی تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا۔ گویا جیسے والدین کو اپنی اولاد کو سکھاتے ہوئے حیاء نہیں آتی، اسی طرح یہ آداب سکھاتے ہوئے حضور ﷺ بھی کسی قسم کی شرم محسوس نہیں فرمارہے۔ آقا ﷺ کا اس فرمان سے یہ پیغام دینا مقصود ہے کہ نہ جاننے والوں کو سکھانے اور شریعت و پاکیزگی کے مسائل سے آگاہ کرتے ہوئے امت کا کوئی فرد شرم محسوس نہ کرے۔

> آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی اُمت کو زندگی کے آداب سکھائے، قدم قدم پر راہ نمائی کی

۴۔ تعلق باللہ کی مضبوطی واستحکام کی تلقین

سیدنا عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک روز میں آقا ﷺ کے ساتھ سواری پر پیچھے موجود تھا، آپ ﷺ نے فرمایا:

يا غلام إني أعلمك كلمات احفظ الله يحفظك۔

اے بچے! میں تمہیں کچھ کلمات سکھاتا ہوں۔ تم اللہ کے احکامات کی حفاظت کرنے والے بن جاؤ تو اللہ تعالیٰ تیری بھی حفاظت کرے گا۔

حضور ﷺ نے پہلے احکاماتِ الٰہیہ کا پابند بنایا اور سمجھانے کا طریقہ کار یہ اپنایا کہ اگر تم چاہتے ہو کہ اللہ تمہاری اور تمہارے معاملات کی حفاظت کرے تو پھر تم پہلے اللہ رب العزت کے احکامات کی حفاظت کرنے والے بن جاؤ۔ پھر فرمایا:

احفظ اللہ تجدہ تجاھك۔

اللہ رب العزت کے حقوق اور اس کے احکامات کی حفاظت کرو۔ اگر تم اللہ کے حقوق کی حفاظت کرو گے تو جہاں تم جاؤ گے، وہیں خدا کو پاؤ گے۔

یعنی جب تم اللہ تعالیٰ کی راہ پر چلنے والے بنو گے تو جس طرح رخ کرو گے، اللہ تعالیٰ کو وہیں پاؤ گے اور اُس کی رحمت، مدد، کرم اور اُس کی نصرت کے حقدار قرار پاؤ گے۔ ہم یہ سوچتے ہیں کہ ہمارے ساتھ کوئی نہیں۔ ہمارا کوئی دوست نہیں، کوئی مددگار نہیں۔ اللہ فرما رہا ہے کہ اے میرے بندے! گھبراتے کیوں ہو؟ تم میرے راستے پر چل کر تو دیکھو، تمہیں کسی اور کو دوست بنانے کی ضرورت ہی نہ رہے گی بلکہ میں ہی تمہارا دوست بن جاؤں گا۔ پھر فرمایا:

إذا سألت فاسأل اللہ۔

جب تو سوال کرے تو اللہ سے سوال کر۔

یعنی اگر سائل بننا ہے، مانگنا ہے تو کسی اور سے کیوں مانگتے ہو، اللہ سے مانگو۔ اللہ سے جب مانگو گے تو خالی واپس نہیں آؤ گے بلکہ وہ ہمیشہ تمہاری مدد کرے گا۔ اللہ رب العزت کی ذات پر عقیدہ اور یقین کو مضبوط کرنے کے لیے حضور ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مزید فرمایا:

وإذا استعنت فاستعن باللہ.

کسی گرداب اور مصیبت میں پھنس جاؤ اور مدد مانگنے کا وقت آجائے تو صرف اللہ سے مدد مانگو۔ پھر فرمایا:

واعلم أن الأمة لو اجتمعت على أن ينفعوك بشيء لم ينفعوك إلا بشيء قد كتبه الله لك ولو اجتمعوا على ان يضروك بشئي لم يضروك الا بشئي قد كتبه الله لك۔

(سنن الترمذی، کتاب صفۃ القیامۃ والرقائق والورع، ۴: ۶۶۷، الرقم: ۲۵۱۶)

یاد رکھ! اگر پوری دنیا بھی اکٹھی ہو جائے کہ تمہیں کوئی نفع پہنچا دے تو وہ ساری دنیا جمع ہو کر بھی تجھے وہی فائدہ پہنچا سکتی ہے جو خدا نے تیرے لیے لکھا ہوا ہے، وہ اُس سے زیادہ تجھے نہیں دے سکتے اور اگر ساری دنیا اکٹھی ہو کر تمہیں نقصان پہنچانا چاہے تو اُس سے زیادہ نقصان نہیں پہنچا سکتی جو اللہ نے تیری تقدیر میں لکھ دیا ہے۔

پس تو زندگی میں ڈرے بغیر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات پر کاربند ہو جا۔ جو تیرے مقدر میں ہے، وہ تجھے ہر صورت مل کر رہے گا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو اس مذکورہ نصیحت کے ساتھ آقا ﷺ نے امت کو بچوں اور اولاد کے اعتقاد اور ایمان کی حفاظت کرنے کی طرف متوجہ فرمایا ہے۔

۵۔ عبادات کا عادی بنانے کا حکم

آقا علیہ السلام نے بچوں کو نماز کا عادی بنانے کی طرف بھی توجہ مبذول کروائی۔ ارشاد فرمایا:

مروا أولادكم بالصلاة وهم أبناء سبع سنين واضربوهم عليها وهم أبناء عشر وفرقوا بينهم في المضاجع.

(سنن أبي داؤد، کتاب الصلاۃ، ۱: ۱۳۳، الرقم: ۴۹۵)

اپنی اولاد کو نماز کا حکم دو، جب وہ سات سال کی عمر میں پہنچ جائیں یعنی اس عمر تک ترغیب دلاؤ، توجہ دلاؤ، مائل کرو۔ اگر وہ دس سال کے ہو جائیں تو پھر اُن کی سرزنش بھی کرو، حکمت کے ساتھ تأدیب بھی کرو اور جب بڑے ہو جائیں تو بچوں کے بستر بھی الگ کر دو۔

حضور نبی اکرم ﷺ کی حکمت اور بصیرت ملاحظہ کریں کہ اگر بچے کو دس سال کی عمر تک بھی نماز کی عادت نہیں پڑی تو سرزنش کرو، اس لیے کہ دس سال میں جو شخصیت بن جاتی ہے، اب وہ کوئی بدل نہیں سکتا۔ سات سال کی عمر میں تو عادت بنانی ہے اور دس سال کی عمر میں پچھلی عادت کو توڑنا ہے۔ جب دس سال گزر گئے تو پھر اُسے نمازی بنانے میں زیادہ مشکل ہو جاتی ہے۔

۶۔ معاشرتی آداب سکھانے کی ہدایت

آقا ﷺ نے اولاد کو کھانے کے آداب بھی سکھائے کہ کھانا اور پینا کس طرح ہے۔ سیدنا عمر بن سلمہ فرماتے ہیں کہ میں چھوٹا بچہ تھا اور آقا ﷺ کی بارگاہ میں بیٹھتا تھا۔ جب کوئی کھانے کا برتن آتا تھا تو میں اپنا ہاتھ اُس میں ڈالتا اور اسے چاروں سمت گھماتا رہتا تھا کہ اپنی مرضی کی چیز آجائے۔ آقا ﷺ نے بڑے پیار اور شفقت بھرے انداز میں فرمایا کہ بیٹے جب کھانا آجائے تو:

يا غلام سم الله وكل بيمينك. وكل مما يليك.

(صحیح البخاری، کتاب الأطعمۃ، ۵: ۲۰۵۶، الرقم: ۵۰۶۱)

اے بچے! پہلے بسم اللہ پڑھا کرو اور اپنے دائیں ہاتھ سے کھایا کرو اور اپنے سامنے سے کھایا کرو۔

یعنی آقا ﷺ کھانے کے دوران نامناسب معاملات سے بھی نہایت پیارے طریقے سے منع فرما دیا کرتے تھے۔ ایک روز آقا ﷺ کی بارگاہ میں کھجوروں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام چھوٹے

تھے۔ آپ تیزی سے آئے اور ایک کھجور اُٹھا کر اپنے منہ مبارک میں ڈال لی۔ آقا علیہ السلام نے جب یہ معاملہ دیکھا تو فرمایا:

كخ كخ ليطرحها ثم قال أما شعرت أنا لا نأكل الصدقة.

(صحیح البخاری، کتاب الزکاۃ، ۲: ۵۴۲، الرقم: ۱۴۲۰)

اِسے ابھی نکال دو، اُنہوں نے نکال دی۔ پھر فرمایا کہ تمہیں پتہ نہیں کہ ہم اہل بیت نبوی صدقہ نہیں کھاتے۔

دوسری طرف ہماری صورتحال یہ ہے کہ ہم ممنوعہ چیزوں کے ارتکاب پر بھی بچوں کو منع نہیں کرتے۔ کوئی بچہ ڈانس کر رہا ہو تو اس کے والدین خوش ہوتے ہیں کہ واہ واہ کیا بات ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اُنہیں منع کیا جائے۔ آج نہیں روکیں گے تو کل نہیں روک سکیں گے۔ والدین کہتے ہیں کہ بچے کو انجوائے کرنے دیں، انجوائے کرنے کی عمر ہے۔ اگر یہی امر ہوتا تو آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اُن بچوں کو انجوائے کرنے دیتے۔ فرماتے کہ چھوٹا بچہ ہے، ابھی اِس پر شریعت کا حکم لاگو نہیں ہوتا، کل اسے یہ چیزیں سکھا دیں گے۔ نہیں، بلکہ فرمایا کہ جو بچپن میں روک دیا جائے وہ مرتے دم تک رکا رہتا ہے۔

بچہ جب 10 سال کا ہو جائے تو حکم دیا گیا ہے وہ نماز نہ پڑھے تو اُس کی سرزنش کرو

میں اس موقع پر اپنی مثال دینا چاہوں گا کہ شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری ہماری تربیت کا اہتمام اس طرح فرماتے کہ بچپن سے ہمارے ذہن میں یہ بات ڈال دی تھی بلکہ اپنے عمل سے سکھا دی تھی کہ منہاج القرآن کے پیسوں کا کوئی کھانا اور کوئی بھی چیز جو ڈارننگ روم میں مہمانوں کے لیے موجود ہو گی، وہ ہمارے لیے حرام ہے۔ یہ شیخ الاسلام کا پیمانہ تقویٰ اور طہارت ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں منہاج القرآن کے پیسوں سے نہ کبھی خود کوئی لقمہ کھاؤں گا اور نہ میری اولاد مرتے دم تک کھائے گی۔ پس جب ڈارننگ روم میں مہمانوں کی ضیافت کے لیے آفیشل فنڈ میں سے کھانا آتا یا چائے، بسکٹ آتے تو ہم بہن بھائیوں میں سے کوئی لاعلمی میں اسے لینے لگتا تو دوسرا خود ہی کہہ دیتا کہ اسے نہ لیں، یہ آفیشل ہے۔ ہمیں لفظ آفیشل کا پتہ تھا اور یہ بھی پتہ تھا کہ یہ ہمارے لیے حلال نہیں۔ شیخ الاسلام نے

چونکہ ہمیں بھی اس سے منع کیا تھا، اِس لیے آج ہماری اولاد بھی ان کو نہیں لیتی اور ان شاء اللہ اُن کی اولاد بھی ان اشیاء پر ہاتھ رکھنے سے پہلے سوچے گی کہ یہ کہاں سے آیا ہے۔ اس طرح کی تربیت گھر سے آتی ہے اور یہ سب آقا علیہ السلام کی حسنین کریمین رضی اللہ عنہما کی تربیت فرمانے کا ایک فیض ہے۔

۷۔ اپنائیت اور شفقت کے ساتھ تربیت کرنے کا حکم

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بچوں پر انتہا درجہ کی شفقت فرماتے۔ اسامہ بن زید بیان کرتے ہیں کہ میں چھوٹا سا تھا اور آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں جاتا تھا: یأخذنی فیقعدنی علی فخذہ۔

آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شفقت فرما کر مجھے اپنی ران مبارک کی ایک سمت بٹھا لیا کرتے تھے اور دوسری طرف سیدنا حسن مجتبیٰ علیہ السلام کو بٹھا لیتے۔ پھر ہم دونوں کو جوڑ لیتے، پیارے کرتے اور پھر فرماتے:

اللھم ارحمھما فإني أرحمھما۔

(صحیح البخاری، کتاب الأدب، ۵: ۲۲۳۶، الرقم: ۵۶۵۷)

اے اللہ تو بھی اِن پر اِس طرح رحم فرما جیسے میں اِن پر رحم کرتا ہے۔

آج ہمیں اس چیز کو سیکھنے کی ضرورت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اولاد کی تربیت سختی، ڈانٹنے اور سرزنش سے نہیں فرمائی بلکہ انھیں اپنائیت دے کر تربیت کا اہتمام فرمایا ہے۔ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ آپ کے اہل بیت اطہار میں سے نہیں ہے مگر آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُن کے ساتھ بھی شفقت اور محبت کا اظہار کر رہے ہیں۔ اولاد اور بچوں کی عزت کرنی پڑتی ہے، اُن کو پیار، حکمت، لطف اور کرم سکھانا پڑتا ہے۔ جب اولاد سیکھ جائے تو پھر وہ ایسا درخت بن جاتی ہے کہ ساری زندگی اُس کا پھل لوگ کھاتے ہیں اور دعائیں بھی دیتے ہیں۔

ایک روز سیدنا امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوئے تو آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن کا بوسہ لیا۔ اس وقت وہاں اقرع بن حابس التمیمی کھڑے تھے، وہ حیران ہو گئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے نواسے کو کس طرح چوم رہے ہیں۔ وہ کہنے لگے کہ یارسول اللہ! میرے تو دس بچے ہیں، میں نے تو آج تک کسی ایک کو بھی نہیں چوما اور آپ اپنے نواسے کو اس طرح چوم رہے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: من لا یرحم لا یرحم

(صحیح البخاری، کتاب الأدب، ۵: ۲۲۳۵، الرقم: ۵۶۵۱)

جو رحم نہیں کرتا اُس پر بھی رحم نہیں کیا جاتا۔

اسی طرح سیدہ کائنات حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا اور حسنین کریمین رضی اللہ عنہما سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت و

شفقت اور اُن کی تربیت کے متعدد واقعات ہیں جو ہمیں اولاد کے ساتھ تعلق اور ان کی تعلیم و تربیت کے بارے میں رہنمائی عطا کرتے ہیں۔

۸۔ بچوں کی حوصلہ افزائی کرنے کی تلقین

اُم خالد بنت سعید فرماتی ہیں کہ مجھے بچپن میں ایک دفعہ میرے والد آقا علیہ السلام کی بارگاہ میں لے گئے۔ اس وقت میں نے زرد رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا۔ آقا علیہ السلام نے جب مجھے اپنی بارگاہ میں دیکھا تو مسکراتے ہوئے میرا لباس دیکھ کر فرمایا: سنا والسنا.

بڑا خوبصورت اور عمدہ لباس پہنا ہوا ہے۔

چھوٹی سی بچی ہیں اور اُنہوں نے عمدہ لباس پہنا مگر غور کریں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کی بھی تعریف فرما رہے ہیں۔ وہ فرماتی ہیں کہ میں خوش ہو گئی اور پھر میری نظر آقا علیہ السلام کی انگوٹھی مبارک پر پڑی جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دست اقدس میں پہنی ہوئی تھی۔ میں نے اُس سے کھیلنا شروع کر دیا۔ میرے والد نے مجھے روکا کہ ایسے نہ کرو۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: نہیں، کرنے دو، کوئی بات نہیں اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے مزید شفقت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

> اگر والدین چاہتے ہیں
>
> کہ اُن کی اولاد تابعدار ہو
>
> تو پھر وہ اُن کی دینی
>
> نہج پر تربیت کریں

أبلی واخلقی۔ ہمیشہ یہی لباس پہنا کرو۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ دو دفعہ فرمایا۔

(صحیح البخاری، کتاب اللباس، ۵: ۲۱۹۸، الرقم: ۵۵۰۷)

معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس شفقت کا تعلق اپنے اہل خانہ اور اہل بیت تک محدود نہیں بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معاشرے کے بچوں سے بھی شفقت فرماتے ہوئے انھیں اخلاق اور تربیت سے مزین فرما رہے ہیں۔

۹۔ بچوں سے خوش طبعی سے پیش آنے کی تاکید

آقا علیہ السلام بچوں سے ظرافت آمیز گفتگو بھی فرمایا کرتے تاکہ بچوں کی طبیعت کے اندر بھی خوش

طبعی پیدا ہو۔ آپ ﷺ اس پہلو کو کبھی اپنی بارگاہ میں اوجھل نہ ہونے دیتے تھے۔ سیدنا انس فرماتے ہیں کہ میرے بھائی کا نام عمیر تھا۔ وہ آقا علیہ السلام کی بارگاہ میں آیا۔ آپ نے پوچھا کہ اِس کا نام کیا ہے؟ بتایا گیا کہ اس کا نام عمیر ہے۔ ان کے پاس ایک پرندہ تھا جو مر گیا۔ جب آپ ﷺ کو معلوم ہوا تو جب بھی عمیر آپ ﷺ کی بارگاہ میں آتے تو آپ ﷺ فرماتے:

یا أباعمیر ما فعل النغیر۔ (صحیح البخاری، کتاب الأدب، ۲۲۹۱:۵-۲۲۷۰، الرقم:۵۷۷۸-۵۸۵۰)

اے ابو عمیر نغیر کا کیا بنا۔

نغیر پرندے کو کہتے ہیں۔ آپ ﷺ اسے بار بار یہی کہتے اور لطف اندوز ہوتے اور مسکراتے۔ جب کسی کے ساتھ اس حد تک اپنائیت، محبت اور احساسات کا تعلق ہو گا تو وہ کیسے تقویٰ، پرہیز گاری اور نیکی و بھلائی کے راستے سے ہٹ کر چلنے کا سوچ بھی سکتا ہو گا، اس کی نظر میں تو ہمیشہ حضور علیہ السلام کی یہی مسکراہٹ، شفقت، محبت، ظرافت غالب رہتی ہو گی۔

۱۰۔ علم، ادب اور اخلاق سکھانے کی نصیحت

حضور ﷺ نے فرمایا: علموهم وأدبوهم۔

(البیهقي، شعب الإیمان، ۶: ۳۹۷، الرقم:۸۶۴۸)

اپنی اولاد کو علم بھی سکھاؤ اور اُن کو ادب بھی سکھاؤ۔

ایک اور مقام پر آپ ﷺ فرمایا:

ما نحل والد ولدا أفضل من أدب حسن

(أحمد بن حنبل، المسند، ۴: ۷۸، الرقم:۱۶۷۶۳)

کسی باپ نے اپنے بیٹے کو اچھے اخلاق سے بہتر کوئی دولت نہیں دی۔ یعنی اگر تم اپنی اولاد کو دولت دینے چاہتے ہو، امیر کرنا چاہتے ہو، اچھا دیکھنا چاہتے ہو تو انھیں اچھے آداب کی دولت سے مالا مال اور سرشار کر دو۔ اگر ادب نہ دے سکے تو پھر بظاہر مالداری ہونے کے باوجود غربت ہی ہے۔

خلاصۂ کلام

آقا علیہ السلام نے فرمایا:

إذا مات الإنسان انقطع عنه عمله إلا من ثلاثة إلا من صدقة جارية أو علم ينتفع به أو ولد صالح يدعوله.

(صحیح مسلم، کتاب الوصیة، ۳: ۱۲۵۵، الرقم:۱۶۳۱)

جب بندہ فوت ہو جاتا ہے تو ہر عمل اُس سے منقطع کر دیا جاتا ہے۔ صرف اس کے تین اعمال ایسے ہیں جو قائم رہتے ہیں:

۱۔ صدقۂ جاریہ: اگر اس نے کوئی مسجد بنادی، آغوش بنادیا، انسانیت کی خدمت کا کوئی مرکز بنادیا، کوئی تعلیمی و فلاحی ادارہ بنادیا تو جب تک وہ ادارہ قائم رہے گا، اُس کا فیض اور اُس کا اجر اُس انسان کو ملتا رہے گا۔

۲۔ علمِ نافع: اگر کسی نے علم کا ایسا چراغ روشن کر دیا کہ اس سے انسانیت کو نفع پہنچ رہا ہے تو اس بندے کا یہ عمل بھی منقطع نہیں ہوتا۔

۳۔ صالح اولاد: اگر کسی بندے کی ایسی اولاد ہے جو نیک اور صالح ہے تو یہ نیک اولاد بھی انسان کو برزخ اور آخرت کی منازل میں کامیابی عطا کرنے کا ذریعہ بنتی ہے۔

ہم اپنی اولاد کی تربیت اگر اس زاویہ سے بھی کر لیں کہ کل جب ہم اپنی قبروں میں چلے جائیں گے تو کوئی ہماری بخشش و مغفرت کے لیے دعا کرنے والا تو ہو گا۔ یہ زاویہ بھی تربیتِ اولاد کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ہمیں متحرک رکھے گا۔ اولاد نیکی اور خیرات کا عمل کرتی رہے تو اس کے اعمال بھی اس کے والدین کے لیے صدقہ جاریہ بن جاتے ہیں۔

اللہ رب العزت ہمیں اپنی اولاد اور نئی نسلوں کو اسلامی تعلیمات سے بہرہ یاب کرنے، اُن کی علمی، فکری، اخلاقی اور روحانی تربیت کرنے اور انھیں دین و دنیا کی ہر جہت سے باادب بنانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین ﷺ

ضرورتِ مذہب اور وجودِ باری تعالیٰ

پروفیسر ڈاکٹر حسین محی الدین قادری (صدر منہاج القرآن انٹرنیشنل)

لامذہبیت (agnosticism) اور دھریت (atheism) ان چند اہم مسائل میں سے ایک ہے جس نے آج پوری دنیا میں بسنے والی مسلمان نوجوان نسل کے اعتقادات کو گھیر رکھا ہے۔ بدقسمتی سے یہ مسئلہ ہر روز پہلے سے زیادہ سنگین اور شدت اختیار کرتا جارہا ہے۔ پہلے یہ مسئلہ دیگر مذاہب کے ماننے والے نوجوانوں کے اذہان کو پیش آیا تھا اور اس نے ان کے اعتقادات کو نقصان پہنچایا مگر آج یہ فتنہ امت مسلمہ کے گھروں میں بھی داخل ہو گیا ہے۔ اگر اس کا کماحقہ سد باب نہ کیا گیا تو یہ آئندہ آنے ادوار میں مسلمانوں کو درپیش اہم ترین چیلنج ہو گا۔

لامذہب (agnostic) کہتے ہیں کہ مجھے پتا نہیں ہے کہ خدا ہے یا نہیں ہے؟ میں نہیں سمجھتا کہ دنیا میں بہتر زندگی گزارنے کے لیے مذہب کی کوئی ضرورت بھی ہے۔ یہ طبقہ جب حد سے بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنے بیان میں مزید اعتماد اور یقین داخل کرتا ہے تو یہ طبقہ دھریہ (atheist) کہلاتا ہے۔ یہ طبقہ کہتا ہے کہ اللہ رب العزت کا کوئی وجود (معاذ اللہ) نہیں ہے، مذہب کی ضرورت نہیں ہے، مذہب صرف انسانوں کا بنایا ہوا ایک نظام ہے جو دوسرے انسانوں کو باندھنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

ان طبقات کی طرف سے دیئے گئے دلائل اور زبان سے وہ آزاد منش نوجوان متاثر ہو جاتے ہیں جن کو دین کی تعلیم نہیں دی گئی۔ ان کو اس طرح کے بیانات بڑے مضبوط لگتے ہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ ہاں، یہ بات صحیح ہے۔

اگر حقیقت کا بنظرِ غائر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مسئلہ دین اور مذہب کے ساتھ نہیں ہوتا بلکہ مسئلہ اپنی تفہیم (understanding) کے ساتھ ہے کہ ان لوگوں نے اپنے دین کو پڑھا کب ہے کہ جو انھیں پتہ ہو کہ یہ دین ہمیں آزاد کرنے کے لیے آیا ہے یا یہ دین ہمیں باندھنے کے لیے آیا ہے۔

لامذہبیت اور دہریت کے مسئلے کا تعلق صرف پاکستان سے باہر بسنے والے مسلمانوں میں نہیں ہے بلکہ پاکستان کے اندر کالجز اور یونیورسٹیز سطح کے کثیر طلبہ بھی اس فتنے کا شکار ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کو بے خبری کہیں یا معصومیت، والدین کو اس کی سمجھ ہی نہیں ہے۔ نوجوان نسل کے اذہان ماڈرن ازم، ماڈرن ایجوکیشن، نئے دور، نئی روایات، کلچر اور سیکولرازم کے نام پر دین، دین کی بنیادی تعلیمات، مذہب، مذہب کی معاشرے میں ضرورت اور یہاں تک کہ اللہ رب العزت کے وجود کے حوالے سے بھی اشکال کا شکار ہو رہے ہیں۔

لادینی طبقہ کی گمراہ کن سوچ

ہے کہ مذہب کی ضرورت

نہیں ہے، مذہب صرف

انسانوں کا بنایا ہوا ہے

اندرون و بیرون ملک سے اس طرح کے کثیر نوجوان وقتاً فوقتاً مجھے ملتے رہتے ہیں اور اپنے رجحانات، خیالات اور میلانات کا تذکرہ کرتے ہیں، اس سے مجھے اس بات کا بخوبی اندازہ ہے کہ کس طریقے سے ان کے ذہن میں مذہب اور مذہب کی ضرورت پر سوالات پیدا ہو چکے ہیں؟ یہاں تک کہ اُن کے اذہان میں یہ بات بھی راسخ ہو چکی ہے کہ اللہ رب العزت کا ہماری روز مرہ زندگی میں عمل دخل کیا ہے۔۔۔؟ اللہ رب العزت کے وجود کی ضرورت کیا ہے۔۔۔؟ سائنس اور مذہب کی بحث کے درمیان انھوں نے اپنے آپ کو یوں confuse کر لیا ہے کہ وہ اپنی تمام روایات پر سوالیہ نشان لگاتے ہیں۔ پھر المیہ یہ ہے کہ وہ اپنے والدین اور بڑوں سے بآسانی ان چیزوں کا تذکرہ بھی نہیں کر پاتے کہ ممکن ہے کہ ایسے سوالات پر ڈانٹ پڑ جائے۔ یہ لوگ عام مجالس میں تو اپنے افکار کا اظہار نہیں کرتے لیکن جب ان کے ساتھ بات کی جائے تو پھر وہ اپنے افکار کا اظہار کرتے ہوئے دین کی ضرورت، مذہبی اقدار، تعلیماتِ دین پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت اور اللہ رب العزت کے وجود پر سوال اٹھاتے ہیں۔

ہم عموماً ایسے پورے طبقے کو ایک ہی نظر سے دیکھتے ہیں کہ یہ ماڈرن لوگ ہیں اور انہیں دین کی سمجھ

نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہے، حقیقت میں یہ دو الگ طبقات ہیں:

۱۔ ایک طبقہ وہ ہے جو ماڈرن ہے یا ممکنہ طور پر بے راہ روی کا شکار ہے، دین، دینی اقدار اور دینی تعلیمات سے زیادہ آشنا نہیں ہے۔ یہ طبقہ بنیادی طور پر دین اور مذہب کی ضرورت پر اعتراض نہیں کرتا اور اللہ رب العزت اللہ رب العزت کی ذات اور وجود کا انکار نہیں کرتا۔

۲۔ دوسرا طبقہ وہ ہے جن کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو گیا ہے کہ معلوم نہیں ہم مذہب کو کیوں مانتے ہیں۔۔۔؟ شاید یہ پرانے دور کی روایات ہیں، جن میں ہم بندھے ہوئے۔۔۔ آج سائنسی دور ہے اور اس دنیا میں ہم نے جینا ہے، ترقی کرنی ہے، پیسہ کمانا ہے، گھر بار بسانا ہے، ہمیں اب دین اور مذہب کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

یہ دو الگ طبقات ہیں۔ میں جس کی طرف توجہ کروانا چاہتا ہوں، وہ یہ دوسرا طبقہ ہے۔ ہمیں اپنے آپ کو، اپنے ایمان کو اور اپنے بچوں کو اس طبقہ اور ان کے افکار سے بچانا از حد ضروری ہے۔

کیا مذہب اور دین ترقی میں رکاوٹ ہے؟

لامذہبیت اور دھریت کی فکر کے حامل طبقہ میں مذہب کی ضرورت اور اللہ کے وجود کے حوالے سے سوالات پیدا ہونے کی ایک وجہ یہ ہے کہ ان نوجوانوں نے ایک نظر سے دیگر اقوام کی معاشی، سائنسی، علمی ترقی اور مختلف علوم و فنون میں ان کی مہارت دیکھی اور دوسری نظر سے انھوں نے یہ دیکھا کہ یہ لوگ بھی مختلف مذاہب کے ماننے والے تھے مگر انہوں نے اپنی مذہبی روایات پر سوال اٹھائے۔ کسی کو اپنی مذہبی کتابوں پر شک ہوا، روایات کے اندر جوڑ توڑ کا مسئلہ نظر آیا، کہانیوں میں صداقت نظر نہ آئی تو انہوں نے اپنے مذہب پر سوال اٹھائے اور مذہب کو اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی سے نکال دیا اور اس کی ضرورت و اہمیت سے انکار کر دیا۔ مسلمان نوجوانوں نے بدقسمتی سے یہ سمجھا کہ شاید ان کی ترقی کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے مذہب کی روایات کی پیروی نہیں کی جبکہ حقیقت یہ تھی کہ ان اقوام کی ترقی کی وجہ ان کی حکومتی پالیسیز تھیں، جس بناء پر وہ ممالک ترقی کرتے گئے۔

مسلمان نوجوان نے ترقی کی وجہ لامذہبیت کو قرار دیا اور کہا ہمارا ترقی نہ کر سکنے کا سبب مذہب ہے، یہ مذہب پاؤں کی زنجیر ہے اور اس نے ہمیں ترقی سے روک رکھا ہے۔ پس ہم نے ان کے دیکھا دیکھی بھیڑ چال میں اپنے نہایت ہی قابل اعتماد دین اور اُس قرآن مجید پر شک کیا جس کی حفاظت اللہ رب العزت نے خود اپنے ذمہ لی ہے اور جس میں سے کوئی ناقد سے ناقد ترین شخص بھی کوئی ایک غلطی نہیں نکال سکتا۔ ہم نے اس دین پر شک کر لیا اور سمجھا کہ شاید ترقی کی راہ میں

مذہب رکاوٹ ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا، ترقی کی راہ میں سیاست، ممالک کی پالیسیز، کرپشن اور دیگر معاشرتی عوامل کارفرما ہوتے ہیں، ترقی نہ کرنے پر مذہب کو موردِ الزام ٹھہرانا درست بات نہیں ہے۔ نوجوان اذہان نے مذہب کو اپنی پاؤں کی زنجیر سمجھ کر دیگر اقوام کی دیکھا دیکھی اپنے مذہب سے بیزاری کا اعلان کر دیا۔

نوجوان نسل میں یہ سوچ اور فکر در آنے کے بعد المیہ یہ ہوا کہ کسی نے نوجوان نسل کے ان سوالوں کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔ اس جلتی آگ کے اندر social میڈیا نے ایندھن اور تیل کا سا کام کیا کہ پوری دنیا کے ایسے مفکرین، intellectual، speakers، trainers کے ساتھ رابطہ کروادیا کہ جنہوں نے طرح طرح کی روایات، professional باتوں، مختلف افکار، قصوں اور کہانیوں سے اپنے بیانیے کو مزین کر کے اس طرح بیان کیا کہ یہ نوجوان اپنی روایات سے منقطع ہوتے چلے گئے اور ایک غیر محسوس انداز میں ان کے اذہان کے اندر مذہب کے حوالے سے مذاق اور اللہ رب العزت کے وجود کی ضرورت نہ ہونے کے حوالے سے باتیں داخل کی گئیں۔ مذہب کی ضرورت اور اہمیت کو اتنا عام اور سطحی بنا کر مختلف طریقوں سے پیش کیا جانے لگا کہ ہمیں اندازہ بھی نہیں ہوا کہ اس پورے معاملے کی اہمیت ہمارے افکار اور ذہن سے کس طرح نظر انداز ہونا شروع ہو گئی۔

ماڈرن ہونے کی دوڑ میں، ایلیٹ طبقے کا حصہ بننے کی دوڑ میں اور اپنے آپ کو ان جیسے بنانے اور پہچانے جانے کی دوڑ میں نوجوان نسل نے ان افکار کو اپنایا۔ غیر محسوس انداز میں اللہ رب العزت کے وجود اور ضرورتِ مذہب کے حوالے سے مختلف باتیں ڈراماز، موویز، گانوں، لٹریچر، ناولز اور کہانیوں کے ذریعے ہماری روزمرہ زندگی میں داخل کی گئیں۔ نتیجتاً ہماری نوجوان نسل اس فتنہ کا بآسانی شکار ہوتی چلی گئی اور ہمیں اس کی خبر بھی نہ ہوئی اور اگر خبر ہوئی بھی تو ہم نے اسے نظر انداز کر دیا۔

لامذہبیت اور دھریت کی طرف رغبت کی وجوہات

لامذہبیت اور دھریت کی طرف نوجوانوں کے مائل ہونے کی بہت سی وجوہات ہیں۔ ان میں سے چند وجوہات کا تذکرہ ذیل میں کیا جاتا ہے:

(۱) علماء کرام کا مناظرانہ رویہ

لامذہبیت اور دھریت کے رجحانات میں اضافہ کی ایک وجہ میرے نزدیک علمائے کرام کا افسوسناک رویہ بھی ہے۔ آج محافل و مجالس کے اندر بھی اور سوشل میڈیا پر بھی علماء کے مناظرانہ رویے اور روش پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسلک دوسرے مسلک کے خلاف اعلان جنگ

کرتا ہے اور اس کی روایات، کتب، لٹریچر اور اس کے بزرگوں کی تعلیمات میں سے اپنی عقل اور سمجھ کے مطابق نقص نکالتا ہے پھر عوام الناس میں اس کی تشہیر کی جاتی ہے اور پھر دوسرے مسالک کو بے نقاب کرنے کی خوشی میں فتح کا جشن مناتا ہے کہ میں نے فلاں مسلک کو لوگوں کے سامنے عیاں کر دیا ہے۔ اسی طرح دوسرے نے اس کے مسلک کے بارے میں اور اس کی کتابوں میں سے خامیاں نکال کر عوام کو بتائیں، تیسرے نے ان دونوں کے مسلک اور مذہب کے بارے میں خامیاں نکال کے عوام الناس کو بتائیں۔ نتیجتاً وہ عام لوگ جو ان کی مجلس میں جا کر بیٹھتے ہیں، وہ ان ہی علماء کی طرف سے ایک دوسرے کے مسالک کے نقائص اور خامیاں سن کر دین سے ہی بے زار ہو جاتے ہیں۔ ان نام نہاد علماء کو اس کی خبر ہی نہیں ہوتی کہ ہمارے اس مناظرانہ رویے کے باعث نوجوان نسل کے ذہن میں مذہب پر سوال پیدا ہو گئے ہیں اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ دین میں سے بھی خامیاں نکل آئیں۔ ایک طبقے نے دوسرے کی اور دوسرے طبقے نے پہلے کی خامیاں بتا دیں، اس کا مطلب ہے کہ سبھی کچھ غلط ہے۔

لامذہبیت اور دہریت کا فتنہ بیرون ملک ہی نہیں پاکستان میں کالجز اور یونیورسٹیز تک بھی آ پہنچا

اس سے اندازہ لگائیں کہ کتنا بڑا ظلم اور مذاق صرف اپنی مسلکی پہچان کو پختہ کرنے کے لیے ہم پورے دین کے ساتھ کرتے ہیں۔ ان مناظروں میں علماء، فقہاء اور ان کے لٹریچر پر سوال اٹھائے جاتے ہیں اور ان کی شخصیات اور کتب کو عوام کی نگاہ میں ہلکا کیا جاتا ہے۔ یاد رکھیں! جب کسی شے کا ادب، اہمیت، ناگزیریت کو ہلکا بنا کر دکھانا شروع کر دیا جائے تو یہ اس کو ختم کرنے کا پہلا اقدام ہوا کرتا ہے۔ اس مرحلہ میں آج کثرت سے مسلمان داخل ہو چکے ہیں۔

علماء کرام کو اپنے اس کردار پر توجہ دینے کی ضرورت ہے اور سوچنا ہو گا کہ جب علماء اُن بزرگان دین اور ان کی کتب اور تعلیمات پر اعتراض کرتے ہیں جو چودہ سو سال میں اسلام کی اقدار، تعلیمات اور عقائد کے محافظ رہے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ حملہ دین کی جڑوں پر حملہ ہے۔ آج ان پر سوال اٹھاتے ہیں تو نتیجتاً لوگ آج ان کا انکار کریں گے اور پھر کل انہی میں سے طبقہ پیدا ہوتا ہے جو کہتے ہیں کہ ہم حدیث کو بھی نہیں مانتے، ہمیں صرف قرآن کافی ہے۔ پھر انہی میں سے طبقہ پیدا ہوتا ہے جو کہتا

ہے ہم قرآن کو بھی نہیں مانتے، ہمیں صرف اللہ کافی ہے اور پھر اسی میں سے وہ طبقہ پیدا ہو جاتا ہے، جو کہتے ہیں کہ ہمیں تو سائنس کافی ہے، ہم اس دنیا میں زندگی گزارنے آئے ہیں، ہم اللہ کی ذات کو بھی نہیں مانتے۔

مناظروں کے وقت اور دوسرے مسالک کے خلاف باتیں کرتے وقت ان نام نہاد علماء کو شاباش دی جارہی ہوتی ہے، کیونکہ ان کے ذریعے کسی ایک خاص مسلک کو تائید میسر آرہی ہوتی ہے لیکن جب وہ فتنہ پھیلتے پھیلتے بنیادی تعلیمات اور دین اور مذہبی حدود کو بھی پار کرنے لگتا ہے تو اس وقت وہ بات اتنے آگے نکل چکی ہوتی ہے کہ اختیار اور کنٹرول میں نہیں آتی اور یہی کچھ آج مسلمانوں کے ساتھ ہو رہا ہے

(۲) والدین کی اولاد کے دین وایمان کی طرف عدمِ توجہی

معاشرے میں لامذہبیت اور دھریت کے فروغ کی دوسری بڑی وجہ میرے نزدیک والدین کا کردار ہے۔ آج معاشی مسائل ہیں، ہر کوئی ایک طرح کے معاشی حالات کے اندر پیدا نہیں ہوا بلکہ وہ مختلف حالات سے گزرتا ہے۔ اپنے معاشی حالات کو تبدیل کرنے کے لیے دوسروں کے کلچر اور روایات ہمیں رغبت دلاتے ہیں اور پھر ہم ان کی راہ پر چل پڑتے ہیں۔ ایسے معاشی حالات کو بہتر بنانے کی غرض سے جب ہم معاشرے کی اشرافیہ کی تقلید کرتے ہیں تو اسی تناظر میں ہمارا بنیادی مقصد بھی یہ ہو جاتا ہے کہ ہمارا بچہ انگریزی بولے، مہنگے سکولز میں جائے، ایلیٹس جیسا لباس پہنے، انہی میں اٹھے بیٹھے، وہی اس کے friends circle ہوں اور اسی طرح کی degrees حاصل کرے۔

یہ طرزِ عمل اور طرزِ زندگی اپنانے کے بعد اب اس کے ایمان، بنیادی عقائد، دین اور تاجدار کائنات ﷺ کی ذات بابرکات کے ساتھ اس کی نسبت کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔۔۔ کیا اللہ رب العزت کے وجود پر ایمان، مذہب کی اہمیت اور اس کے عقائد باقی بچتے ہیں یا نہیں بچتے۔۔۔؟ اس سے ہمارا سروکار نہیں ہے۔ بہت عرصہ بعد اس چیز کا احساس اور شعور ہمارے ذہنوں میں پیدا ہوتا ہے لیکن اس وقت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔

ایک صاحب مجھے ملے اور رو کر کہنے لگے کہ دعا کریں کہ میرے بچے بچ جائیں۔ میں نے کہا کہ آپ نے ان کو بچانے کے لیے خود کیا کیا ہے؟ اب وہ عمر کے جس حصے میں داخل ہو گئے ہیں، یہاں اب اللہ تعالیٰ کوئی کرم فرما دے تو خیر ہو جائے مگر جب آپ کی ذمہ داری تھی، اس وقت تو آپ نے سرپرستی نہیں کی، اس وقت تو مال کمانے کی دوڑ تھی، کتنے سال اپنے بچوں کے سرپر نہیں رہے اور ان کو چھوڑ دیا،

کیوں؟ کیونکہ ایک اچھا بڑا گھر بنانا تھا، بڑی سواری لینی تھی، زیادہ پیسے کمانے تھے اور آج جب آپ لوٹ کر واپس ان کے سروں پر آئے ہیں تو اس وقت وہ تربیت کی عمر سے نکل چکے ہیں۔ اب وہ اپنے عقائد اور فکر پختہ کر چکے ہیں۔ اب اتنی آسانی سے یہ تبدیلی نہیں ہو گی۔

سمجھانا یہ مقصود ہے کہ آج والدین ایک طرف اس امر کی طرف توجہ نہیں دیتے کہ سکول سے بچے کیا سیکھ کر آتے ہیں اور دوسری طرف خود بھی گھر میں دین اور عقائد کے حوالے سے ان کی رہنمائی نہیں کرتے۔ انھیں اس بات کی پرواہ نہیں ہوتی کہ وہ دین اور عقائد کے حوالے سے کیا نئی بات سکول سے لے کر آئے ہیں۔ کیونکہ وہ بات ہماری توجہ اور دلچسپی کا مرکز نہیں ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ امتحانات میں اچھے نمبرز آنے چاہئیں۔۔۔ degree اچھے طریقے سے کی ہے یا نہیں کی ہے۔۔۔؟ تمہاری جاب کیسی ہے۔۔۔؟ کتنا اچھا career ہے۔۔۔؟ کتنے بڑے ادارے میں ملازمت ہو گئی ہے۔۔۔؟ بس یہ چیزیں ہمارے لیے فخر کا باعث ہیں۔ ہمیں اس چیز سے سروکار ہی نہیں رہا کہ ہمارے بچوں میں ایمان اور عقیدے کی پختگی کتنی ہے اور وہ اپنی اصل اور جڑوں سے آج کتنا جڑے ہوئے ہیں۔

نوجوانوں کو اس گمراہی سے بچانے کیلئے سنجیدہ فکری کاوش نہیں کی گئی، سوشل میڈیا نے جلتی پر تیل کا کام کیا

یہ زمانہ عیسائیت، ہندوازم اور دیگر مذاہب نے بھی دیکھا ہے اور اب یہ فتنہ مسلمانوں میں داخل ہو گیا ہے اور تاریخ دہرائی جا رہی ہے۔ اگر اس فتنے کا سدباب آج نہ کیا گیا تو ہم دیکھ سکتے ہیں کہ باقی اقوام کے ساتھ جو ہو گیا ہے، وہ عمل یہاں پر بھی رونما ہو گا۔ اگر ہم نے اس مسئلے پر توجہ نہ دی اور والدین نے اپنے بچوں کے ایمان اور عقائد کے حوالے سے کردار ادا نہ کیا تو اس کا نتیجہ بہت بھیانک ہو سکتا ہے۔ ہم اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے چھوٹی عمروں میں اپنے سے جدا کر دیتے ہیں اور اس وقت ان میں دین کے حوالے سے پختگی بھی نہیں ہوتی۔ انھیں اعلی تعلیم کے لیے دوسرے ملکوں میں بھیجتے ہیں جو کہ اچھی بات ہے لیکن ٹھونک بجا کر پہلے اپنے بچوں کے عقائد چیک کر لیں کہ دین میں کتنا پختہ ہے۔۔۔؟ یہ وہاں جا کر ڈٹا رہے گا یا ان مغربی افکار، عقائد اور نئے fashion کی رو میں بہہ کر لامذہب اور دہریہ ہو جائے گا۔۔۔؟

کسی بھی فکر مند والدین کے اندر سب سے زیادہ بنیادی فکر یہ ہوتی ہے کہ بچے گناہ کی زندگی میں داخل نہ ہو جائیں، یاد رکھیں! مذہبیت اور دھریت کا فتنہ اس گناہ والی زندگی سے بھی زیادہ بڑا ہو گیا ہے، اس لیے کہ یہ عقائد پر حملہ ہے اور دین ہاتھ سے جا رہا ہے۔ ہر کوئی آج علامہ اقبال جیسے پختہ اعتقاد والا نہیں بچا کہ جنہوں نے کہا تھا:

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

پہلے بچوں کی آنکھوں میں خاکِ مدینہ اور نجف کا سرمہ ڈالیں اور پھر ان کو بے فکری سے جہاں مرضی روانہ کر دیں۔ اگر یہاں پر بھی رہتے ہوئے ان کی آنکھوں کو خاکِ مدینہ و نجف کا سرمہ نصیب نہ ہو، یعنی ان کے عقائد پختہ نہ ہوں، آقا علیہ السلام کی غلامی میں پختگی کے ساتھ داخل نہ ہوں، ڈٹ کر اپنے عقائد کے ساتھ کھڑے نہ ہوں تو بیرون ملک ان کے عقائد و ایمان کی حفاظت کیسے ممکن ہو گی؟ جب والدین کی سرپرستی میں نہ بچ سکے تو وہاں ان کے اعتقادات کو کون بچائے گا؟ اس لیے اگر اعلیٰ تعلیم دلوانا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے ضروری ہے کہ بچپن سے خاکِ مدینہ و نجف کا سرمہ ان کی آنکھوں میں ڈالیں۔ مراد یہ کہ ان کو عقیدہ و ایمان میں یوں پختہ کر دیں، گوندھ دیں کہ ان کی خمیر میں دین و ایمان کی حقانیت رچ بس جائے اور پھر وہ دنیا کے کسی بھی خطے میں جائیں، ان کے اعتقادات پر جہاں مرضی سے ہوا چلے، جو مرضی حملہ ہو جائے مگر وہ اصل عقیدہ و ایمان سے ہل نہ سکیں گے۔ یہ تب ممکن ہو گا کہ جب ہم اپنے بچوں کی اس نہج پر تربیت کریں گے۔

(۳) تعلیمی اداروں کا سیکولر نصاب

لامذہبیت اور دھریت کے فروغ کی تیسری بڑی وجہ تعلیمی ادارہ جات اور ان کا سیکولر نصاب ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ہمارا بچہ او لیول اور اے لیول کر رہا ہے، اس کے اتنے A، اتنے +A، اتنے +B ہیں۔ بس یہی دوڑ ہے۔ کیا کبھی ہم نے دیکھا ہے کہ وہ وہاں نصاب کیا پڑھ رہا ہے؟ کیا ہم نے گھر آ کر اس کے لیے اہتمام کیا ہے کہ ہم اس سے سوالات کریں، اس کو چیک کریں کہ اس تعلیمی ادارہ کے نصاب نے میرے بچے کے اعتقاد اور ایمان کو کتنا نقصان پہنچایا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس نقصان کا سدباب کریں اور ان سکولز کے علاوہ انھیں ایسی جگہوں اور مجالس میں بھی لے کر جائیں جہاں سے وہ خیر حاصل کریں۔ ہم خود تو آ جاتے ہیں مگر اپنے بچوں کو ان کے امتحانات اور تعلیمی سرگرمیوں کے سبب نہیں لاتے نتیجتاً وہ ان اعتقادات سے قدرتی طور پر دور ہوتے چلے جاتے ہیں۔

میں نے خود ایسی کتابیں دیکھی ہیں جو پاکستان کے سکولز میں پڑھائی جاتی ہیں اور اُن کے ذریعے ہمارے بچوں کے اصل عقیدہ اور ایمان پر غیر محسوس انداز سے حملہ کیا جارہا ہے۔ ایک کتاب میری نظر سے گزری جہاں حضور نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ مبارکہ پر موجود ایک باب کا نام صرف "life of Muhammad" ہے۔ لفظِ Muhammad سے پہلے نہ ﷺ لکھا گیا، نہ "حضرت" لکھا اور نہ "سیدنا" لکھا ہے یعنی کوئی احترام اور ادب کے القابات نہیں ہیں۔ یعنی ایک چھوٹی عمر کے بچے کے اندر یہ چیز داخل کر دی کہ جیسے دیگر انبیاء کرام علیہم السلام ہیں بس ایسے ہی تاجدار کائنات ﷺ کی ذات بھی نبی ہے۔ جتنا احترام کا تقاضا دیگر انبیاء کرام علیہم السلام کی ذات کرتی ہے، بس اسی طرح کا تعلق ایک مسلمان کا آقا علیہ السلام کی ذات کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ جب ادب کو اس سطح پر لے آئیں گے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ جب مغرب سے کسی اور مذہب کا ماننے والا نوجوان اپنے انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ ادب کے حوالے سے کمی بیشی کرے گا تو اس مسلمان بچے کے ذہن میں چونکہ بچپن سے ہی دیگر انبیاء کرام علیہم السلام اور آقا علیہ السلام کی ذات برابر ہو چکی ہے تو وہ بھی اپنے نبی کو ویسے ہی treat کرے گا اور اس کے لیے یہ معیوب بات نہیں ہوگی۔

والدین، اساتذہ اور علمائے کرام نے نوجوانوں کی دینی و ایمانی نہج پر تربیت کا فریضہ انجام نہیں دیا

اس کے اس رویے کی بنیاد تعلیمی اداروں میں قائم ہوئی مگر کسی نے نہ روکا؟ جب وہ پرورش کے مرحلہ میں تھا، ترقی کر رہا تھا، تعلیم کے مراحل سے گزر رہا تھا تو اس نہج سے اس وقت اس کی تربیت کسی نے نہ کی اور دین کی بنیادی تعلیمات پر کسی نے اسے پختگی نہ دی۔ دوسرا المیہ یہ ہے کہ جب دینی، اخلاقی اور روحانی مجالس میں اور بزرگوں کی خدمت میں بچوں کو لے جایا جاتا ہے تو پھر خاندان اور معاشرے کے لوگ ان کو نشانہ بناتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ "اس کو مذہبی بنا رہے ہو۔۔۔ اس کو صوفی بنا رہے ہو۔۔۔ اس طرح یہ modern دنیا کے قابل نہیں رہے گا۔" افسوس کہ اس دنیا کی خاطر ہم نے دین و ایمان کو فروخت کر ڈالا۔ ایسی دنیا؛ جس سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے وجود کی پہچان اور ان کا ادب جاتا رہے، تاجدار کائنات ﷺ کی ذات بابرکات کے ساتھ نسبت جاتی رہے، دین اور

آخرت جاتی رہے، ایسا ماڈرن ازم، دنیا اور ترقی چولہے میں جائے، جس کا نتیجہ یہ ہو۔ یاد رکھیں! ترقی، سائنس، ٹیکنالوجی اور اعلیٰ تعلیم قبول ہے، اچھی ہے، حاصل کرنی چاہیے لیکن اپنی اقدار کے تحفظ کے ساتھ اسے جاری رکھی جائے۔ اقدار کو اگر مضبوطی کے ساتھ تھامے رکھا جائے اور ان کا دامن نہ چھوڑا جائے تو پھر انسان جتنی مرضی ترقی کرتا چلا جائے تو وہ نقصان دہ نہیں ہوتی۔

(۴) بے راہ روی

لامذہبیت اور دھریت کی چوتھی بڑی وجہ میرے نزدیک بے راہ روی ہے۔ معاشرے کے اندر نئے رجحانات اور میلانات جنم لے رہے ہیں، جن کے سبب نوجوان گناہ اور بے راہ روی کی طرف بڑھتے چلے جارہے ہیں۔ نوجوان کچے ذہن کے حامل ہوتے ہیں، جب بچے عمر کے چھوٹے حصے میں ہوتے ہیں تو آزادی مانگتے ہیں، والدین کی لگائی ہوئی پابندی بھی انھیں بوجھ لگتی ہے تو چہ جائیکہ ان کے اوپر اس سے بڑے درجے کی مذہبی پابندیاں لگادی جائیں۔ یہ گھریلو اور مذہبی پابندیاں انھیں بڑا بوجھ محسوس ہوتی ہیں۔ نوجوان جب بے راہ روی، گناہ اور اس دنیا کی رنگینی کی طرف مائل ہوتے ہیں تو ایسے حالات میں اگر کوئی ان کو کہہ دے کہ یہ مذہب تمہارے پاؤں کی زنجیر ہے، تمہیں مشکل میں ڈالتا ہے، تمہارے لیے پابندیاں پیدا کرتا ہے تو ان کو اس قسم کے بیانات بڑے اچھے لگتے ہیں۔ پس اس طرح یہ بے راہ روی بذاتِ خود لامذہبیت اور دھریت کی طرف مسلم نوجوانوں کو لے جانے کا ایک بڑا ذریعہ بن رہی ہے۔

لامذہبیت اور دھریت کے بڑھتے ہوئے اس طوفان کو روکنے اور ایمان و اسلام کے لیے اسکے مضر ترین نقصانات کا تدارک کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم مذکورہ چار وجوہات کی طرف متوجہ ہوں اور علماء، والدین، اساتذہ اور معاشرہ اس حوالے سے اپنی ذمہ داریاں ادا کرے۔ (جاری ہے)

عصرِ حاضر کا اَخلاقی اِنحطاط

اسباب اور اثرات کا تحقیقی جائزہ

ڈاکٹر شفاقت علی شیخ

عصرِ حاضر میں ہمہ گیر نوعیت کا اخلاقی انحطاط جو ہر سمت میں دکھائی دے رہا ہے اُس کے کئی اسباب ہیں اُن میں سے چند نمایاں ترین اسباب کو سطورِ ذیل میں اختصار کے ساتھ بیان کیا جا رہا ہے۔

۱۔ جہالت

قرآنِ مجید میں ہے:

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ۔

”اور کون ہے جو ابراہیم (علیہ السلام) کے دین سے رُوگرداں ہو سوائے اس کے جس نے خود کو مبتلائے حماقت کر رکھا ہو۔“ (البقرہ۲: ۱۳۰)

یہاں ملتِ ابراھیمی جو کہ فطرتِ سلیمہ کا تقاضا ہے، اُس سے اعراض کی وجہ جہالت کو قرار دیا گیا ہے۔ یہ جہالت ہی ہے جو حقیقت کے چہرے پر پردہ ڈال دیتی ہے اور انسان کو گمراہی اور بے راہ روی کی وادیوں میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتی ہے۔ جس طرح رات کی تاریکی میں انسان کو کچھ دکھائی نہیں دیتا اور وہ ادھر اُدھر ٹامک ٹوئیاں مارتا پھرتا ہے، ایسے ہی جاہل آدمی فکری انتشار میں مبتلا ہوتا ہے اور ظن و تخمین اور ھوائے نفس کا شکار ہو کر راست روی سے دور ہٹتا چلا جاتا ہے۔

اسلام کے نزدیک علم سے مراد کسی مخصوص شعبے کا علم نہیں ہے جس سے انسان کا روزگار وابستہ ہو بلکہ وہ علم جو کائنات کے حقائق کو اُس پر آشکار کردے اور زندگی کے قوانین سے آگاہ کردے۔ اس میں قرآن و حدیث تو بدرجہ اولیٰ شامل ہیں تاہم جدید علوم کی بھی نفی نہیں ہے بلکہ اُن میں مہارت حاصل کرنا بھی مطلوب اور مستحسن ہے۔ قرآن و حدیث اور اسلامی لٹریچر میں اس حوالے سے دو الفاظ استعمال ہوتے ہیں ایک تعلیم اور دوسرا تربیت۔ یہ دونوں الفاظ اگرچہ ایک دوسرے کے مترادف ہیں اور ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوتے ہیں تاہم پھر بھی ان دونوں میں فرق ہے۔ تربیت کے مقابلے میں تعلیم کا دائرہ کار محدود ہے۔ تعلیم کے ذریعہ صرف عقلی قوتوں کو اُجاگر کیا جاتا ہے جب کہ تربیت کے ذریعہ انسان کی جملہ فطری قوتوں کو پروان چڑھایا جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر تربیت سے مراد انسان کی جسمانی، عقلی، روحانی اور فکری قوتوں کو اُجاگر کرنا ہے اور پرورش کے ذریعے اُن کی مخفی صلاحیتوں کو کمال تک پہنچانا ہے۔

علم سے مراد فقط حصولِ روزگار نہیں ہے، علم انسان پر کائنات کے حقائق آشکار کرتا ہے

جب ایک بچہ دُنیا میں آتا ہے تو اُس کا پاک دل ایک صاف شفاف عمدہ جوہر کی مانند ہوتا ہے، جو ہر طرح کے نقش و نگار سے خالی ہوتا ہے۔ اس پر جس طرح کا نقش جمانا چاہیں جم جائے گا۔ اگر اچھی عادتوں کا خوگر بنایا گیا اور تعلیم و تربیت کا عمدہ بندوبست کیا گیا تو وہ دنیا و آخرت میں سعادت مند ہوگا اور اُس کے والدین، مربی اُس کے اجر و ثواب میں برابر کے شریک ہوں گے اور اگر اُس کی تعلیم و تربیت میں غفلت برتی گئی اور اُسے بُری عادتوں کا خوگر بنایا گیا تو وہ ہلاک و برباد ہوگا اور اُس کی ذمہ داری اُس کے سرپرستوں پر ہوگی۔ جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا (التحریم ۶۶: ۶)

”اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو اس آگ سے بچاؤ“۔

المیہ یہ ہے کہ آج تعلیم سے تربیت کو جدا کر دیا گیا ہے۔ جس کے نتیجہ میں انسان سازی کا کام رُک گیا ہے۔ پھر تعلیم کا تصور بھی محض کسی خاص شعبے میں پیشہ وارانہ مہارت تک محدود ہو کر رہ گیا ہے جس کی وجہ سے انسان پڑھ لکھ کر ڈاکٹر، انجینئر، سائنس دان، بزنس مین وغیرہ میں سے کوئی ایک بن جاتا ہے

لیکن صحیح معنوں میں انسان نہیں بن پاتا اور اخلاقی اعتبار سے بہت سارے نقائص کا شکار ہو جاتا ہے اور اس کی زندگی کے اندر توازن نہیں رہتا۔ آج معاشرہ میں بہت ساری خرابیوں کی وجہ جہالت ہے۔ توہم پرستی، فرقہ واریت، رسوم ورواج کی اندھا دھند پیروی اور مختلف قسم کے تعصبات وغیرہ جیسے کتنے ہی معاشرتی امراض ہیں جو جہالت کی آغوش مین پروان چڑھتے ہیں اور معاشرے کے فطری ارتقاء اور ترقی میں رکاوٹ کا باعث بنتے ہیں۔

تعلیم وتربیت پر مندرجہ ذیل چار عوامل اثرانداز ہوتے ہیں:

۱۔ گھر ۲۔ مدرسہ یا سکول

۳۔ معاشرہ ٤۔ مملکت یا حکومت

یہی وہ چار ادارے ہیں جن کے سانچے میں ڈھل کر کسی فرد کی شخصیت نشوونما کے مراحل طے کرتی ہے۔ بدقسمتی سے آج ان چاروں میں ہی بگاڑ آچکا ہے اور کسی بھی جگہ وہ مثالی ماحول نہیں ہے جس میں پروان چڑھ کر اعلیٰ اخلاقی صفات کی حامل شخصیات معرضِ وجود میں آئیں۔ چنانچہ ہر آنے والے دن میں بگاڑ اور زوال کی رفتار بڑھتی جارہی ہے اور اسے روکنے کی کوئی بھی کوشش کارگر نہیں ہورہی۔

۲۔ غربت

اخلاقی بگاڑ کا دوسرا ایک اہم سبب غربت ہے جس کی وجہ سے انسان بعض اوقات نہ چاہتے ہوئے بھی کئی قسم کی اخلاقی قباحتوں کا مرتکب ہورہا ہوتا ہے۔ حضور علیہ السلام نے غربت کے اس پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

کاد الفقر أن یکون کفرا۔

(کنز العمال، الباب الثالث، الفصل الأول في فضل الفقر والفقراء، الفقر الاضطراري، ٦: ٢١٠، رقم: ١٦٦٨٢)

مطلب یہ ہے کہ فقر وفاقہ اور تنگدستی کی حالت انسان کو اس حد تک مجبور کرسکتی ہے کہ وہ کُفر کی طرف جانے پر آمادہ ہوجائے جو کہ بداخلاقی کا آخری درجہ ہے۔ وجہ یہ ہے کہ انسان کے کچھ بنیادی تقاضے مثلاً کھانا پینا وغیرہ ایسے ہیں جن کے بغیر اُس کا گزارا ہی نہیں ہے۔ اگر کچھ وقت کے لیے ان تقاضوں کی تکمیل نہ ہونے پائے تو انسان کے دل ودماغ میں اضطراب اور بے چینی کی کیفیت جنم لینے لگتی ہے جو ایک حد سے بڑھ جائے تو ضبط کے بندھن ٹوٹ جاتے ہیں اور انسان ایسے اعمال کا ارتکاب بھی کر گزرتا ہے جن کے متعلق معمول کے حالات میں وہ سوچ بھی نہیں سکتا۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کا قول ہے:

”اخلاق، حالات سے پیدا ہوتے ہیں، محض علوم سے نہیں۔“ (شاہ ولی اللہ، البدور البازغہ، ص ۵۰)

اس بلیغ جملے میں شاہ ولی اللہؒ نے انسانی زندگی کی اس اہم حقیقت کو بیان کیا ہے کہ اخلاق اور معیشت کا گہرا تعلق ہے۔ جب تک کسی شخص کی کم از کم معاشی ضروریات کو پورا نہ کیا جائے اُس سے اخلاقِ فاضلہ کی توقع نہیں رکھی جاسکتی۔ جب اخلاق اور معیشت کا ربط ٹوٹ جاتا ہے تو معاشیات اور اخلاقیات دونوں کا شدید بحران سامنے آتا ہے جس کا اثر مذہب و اخلاق، پرسکون زندگی، انسانوں کے باہمی روابط اور تہذیب و تمدن سبھی پر پڑتا ہے۔ انسانوں کے اجتماعی اخلاق اُس وقت بالکل برباد ہو جاتے ہیں جب کسی کو اقتصادی تنگی پر مجبور کر دیا جائے۔

انسانی معاشروں میں دیگر خصوصیات اور صلاحیتوں کے علاوہ درجاتِ معیشت کا تفاوت بھی صورتِ واقعہ اور حقیقت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا۔

”ہم اِن کے درمیان دنیوی زندگی میں ان کے (اسبابِ) معیشت کو تقسیم کرتے ہیں اور ہم ہی ان میں سے بعض کو بعض پر (وسائل و دولت میں) درجات کی فوقیت دیتے ہیں (کیا ہم یہ اس لیے کرتے ہیں) کہ ان میں سے بعض (جو امیر ہیں) بعض (غریبوں) کا مذاق اڑائیں (یہ غربت کا تمسخر ہے کہ تم اس وجہ سے کسی کو رحمتِ نبوت کا حقدار ہی نہ سمجھو)۔“ (الزخرف ۴۳: ۳۲)

قرآنِ مجید نے اس کی حکمت یہ بیان کی ہے کہ انسانوں کی ضروریات اسی طرح پوری ہو سکتی ہیں اور باہمی تعاون کا مقصد بھی اسی سے حاصل ہو سکتا ہے لیکن اس فرق کو فطری حدود کے اندر رہنا چاہیے۔ یہی تفاوت جب حد سے بڑھنے لگے اور معاشرے کے دو طبقات کے درمیان ناقابلِ عبور خلیج کی صورت اختیار کرنے لگے تو پھر ایک محدود طبقہ لامحدود وسائل پر قابض ہو جاتا ہے جب کہ بہت بڑی اکثریت کے لیے دو وقت کی روٹی کا حصول اور جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ صورتِ حال کسی بھی معاشرے کے لیے ایک المیہ ہوتی ہے جو محروم اور پسماندہ طبقات کے ذہنوں میں منفی رجحانات پیدا کرتی ہے اور جن کا نتیجہ اخلاقی بگاڑ کی صورت میں نکلتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظامِ ریاست میں حکومت کے لیے لوگوں کے بنیادی لوازماتِ حیات کی فراہمی کو اہم ذمہ داری قرار دیا گیا ہے۔

دنیا کے خالق نے یہاں وسائل فراوانی سے مہیا کیے ہیں لیکن اُن وسائل کی تقسیم میں ناانصافی، حکمران طبقے کی لوٹ مار، اقربا پروری، بددیانتی اور اسراف نیز جاگیرداری اور سرمایہ داری پر مشتمل

استحصالی نظام ہے جو وسائل کو چند ہاتھوں میں مرتکز کر دیتا ہے اور لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد خطِ غربت سے نیچے زندگی بسر کر رہی ہوتی ہے۔

۳۔ عیش و عشرت

جس طرح بہت زیادہ غربت اخلاقی مسائل کا باعث بنتی ہے اسی طرح حد سے زیادہ امارت بھی انسان کو اخلاقی اعتبار سے ناکارہ کر دیتی ہے۔ مال و دولت اور وسائلِ حیات کی فراوانی سے انسان میں بے فکری پیدا ہوتی ہے اور وہ انواع و اقسام کی لذتوں، راحتوں، آسائشوں، تن آسانیوں اور عیش و عشرت کا دلدادہ بنتا چلا جاتا ہے، جس کے نتیجے میں اخلاقی زوال اور انحطاط کا شکار ہو جاتا ہے۔ تاریخ کے دامن میں ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں، جہاں عیش و عشرت میں مبتلا اقوام اخلاقی بگاڑ میں مبتلا ہو کر تباہ و برباد ہو گئیں۔ ماضی بعید میں رومی اور ایرانی اقوام جبکہ ماضی قریب میں مغلیہ حکمرانوں کی عیاشی اور مسرفانہ زندگی اور اُس کے عبرتناک انجام کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ اسلام میں بہت زیادہ عیش و عشرت کو اسی لیے ناپسند کیا گیا ہے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے:

> تعلیم سے تربیت جدا ہونے کے باعث انسان سازی کا کام رک گیا ہے

ایاك والتنعم فان عباد الله ليسوا بالمتنعمين۔

”اپنے آپ کو لذت طلبی سے بچانا۔ اللہ کے بندے لذتوں کے عادی نہیں ہوتے۔“ (ہیثمی، مجمع الزوائد، ۱۰:۲۵۰)

حضور علیہ السلام کی دعاؤں میں سے ایک دُعا ہے جس میں غربت اور امارت دونوں کے فتنہ سے پناہ مانگی گئی ہے:

ومن شر فتنة الغنى وأعوذ بك من فتنة الفقر۔

(بخاری، کتاب الدعوات و قول اللہ تعالی ادعوني أستجب لكم، ۵: ۲۳۴۱، رقم: ۶۰۰۷)

”اور میں امارت اور غربت کے فتنہ سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔“

چنانچہ حد سے بڑھا ہوا فقر ہو یا اسراف و تبذیر دونوں ہی انسان کو اُمورِ سعادت اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کے بارے میں غور و فکر کی صلاحیت سے عاری کر دیتے ہیں اور انسان کی توجہ اخلاقِ عالیہ سے ہٹ جاتی ہے۔ پسندیدہ طرزِ زندگی یہ ہے کہ انسان مناسب حد تک اپنی ضروریات پوری کرتا ہو۔ مال و دولت سے کنارہ کشی مناسب نہیں کہ یہ ایک نعمت ہے اور ضروریاتِ زندگی کے حصول کا ذریعہ اور وسیلہ ہے لیکن انسان کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ وہ کچھ وقت فرصت کا نکالے اور سعادتِ اُخروی کے حصول پر توجہ دے۔ یہ مقصد اُسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب اُس کی معیشت تنعّم پسندی اور فقر و مسکنت دونوں کے درمیان اعتدال اور توازن پر مبنی ہو۔

۴۔ سماجی عدل کا فقدان

اسلام نے جن اخلاقی اور معاشرتی اُمور پر سب سے زیادہ زور دیا ہے اُن میں سے ایک عدل ہے۔ عدل کے لفظی معنی ہیں کسی چیز کو برابر دو حصوں میں تقسیم کرنا۔ اصطلاحی مفہوم یہ ہے کہ جو بات ہم کہیں یا جو کام کریں اُس میں سچائی کی میزان کسی طرف جھکنے نہ پائے اور وہی بات کہی جائے اور وہی کام کیا جائے جو سچائی کی کسوٹی پر پورا اُترے۔ اس کے معنی کسی چیز کو اُس کے صحیح موقع محل میں رکھنے کے بھی ہیں۔ اور اس کی ضد ظلم کا لفظ ہے جس کے معنی کسی چیز کو کسی غلط جگہ رکھنا ہے جو اس کے لیے مناسب نہ ہو۔ پس اسلامی اخلاق کی رو سے عدل و انصاف کا معنی یہ ہے کہ ہر شخص کے ساتھ بلا رو و رعایت وہ معاملہ کرنا جس کا وہ حق دار ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا اہم ترین مقصد عدل و انصاف پر مبنی انسانی معاشرہ کا قیام ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ۔ (الحدید ۵۷: ۲۵)

”بے شک ہم نے اپنے رسولوں کو واضح نشانیوں کے ساتھ بھیجا اور ہم نے اُن کے ساتھ کتاب اور میزانِ عدل نازل فرمائی تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہو سکیں۔“

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اُسوہ حسنہ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلفائے راشدین کے طرزِ حکومت پر نگاہ ڈالیں تو بے لاگ عدل ہی ان حکومتوں کا بنیادی رکن نظر آتا ہے۔ ایسا عدل جو اپنے و بیگانے، مسلم و غیر مسلم، عربی و عجمی اور امیر و غریب سب کے لیے یکساں اور بلا امتیاز ہو۔ عدل و انصاف وہ صفت ہے جس پر دنیا کا نظام قائم ہے۔ جس قوم اور جس معاشرے میں عدل و انصاف نہ ہو وہ رحمتِ خداوندی سے محروم رہتا ہے اور دنیا میں بھی ذلت و رسوائی اُس کا مقدر بنتی ہے۔ عدل کسی بھی معاشرہ کو چلانے میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ عدل انفرادی ہو یا اجتماعی، جو معاشرہ اس سے صرفِ نظر کرتا ہے اُس کی شکست و ریخت نوشتہ دیوار بن جاتی ہے۔

چنانچہ کسی معاشرہ میں عدلِ اجتماعی کا ماحول نہ ہونا اُس میں کئی طرح کی خرابیاں پیدا کرتا ہے۔ نہ مظلوم کی دادرسی ہوتی ہے اور نہ ظالموں کو اُن کے کیے کی سزا ملتی ہے۔ ظلم و بربریت اور جبر و تشدد کا ماحول ہوتا ہے کسی کی جان، مال اور عزت و آبرو محفوظ نہیں ہوتی جس کے نتیجے میں حرص، لالچ، طمع، خود غرضی، بے حسی اور سنگدلی جیسے اخلاقی امراض جنم لیتے ہیں جو معاشرے کو انسانیت کے بلند مقام سے گرا کر حیوانیت کی چراگاہ بنا دیتے ہیں۔

اخلاقی انحطاط کے اثرات و نتائج

اللہ تعالیٰ نے دنیا کو امتحان گاہ بنایا ہے اور یہاں امتحان کی غرض سے ہر انسان کو ایک مخصوص مدت کے لیے رکھا جاتا ہے۔ انسان عمل کرنے میں تو آزاد ہے لیکن اُس کے انجام سے بچنے میں آزاد نہیں ہے۔ پھر قانونِ قدرت یہ بھی ہے کہ انسان اچھا یا بُرا جو عمل بھی کرتا ہے اُس کا اصلی اور حقیقی بدلہ تو آخرت میں ہی ملے گا لیکن ایک ابتدائی بدلہ دنیا میں بھی ملتا ہے۔ اس بات کی وضاحت قرآنِ مجید کی مندرجہ ذیل آیات سے کی جاسکتی ہے:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔ (النحل ۱۶: ۹۷)

”جو کوئی نیک عمل کرے (خواہ) مرد ہو یا عورت جب کہ وہ مومن ہو تو ہم اسے ضرور پاکیزہ زندگی کے ساتھ زندہ رکھیں گے، اور انہیں ضرور ان کا اجر (بھی) عطا فرمائیں گے ان اچھے اعمال کے عوض جو وہ انجام دیتے تھے۔“

ایک اور مقام پر فرمایا:

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى۔ (طٰہٰ ۲۰: ۱۲۴)

”اور جس نے میرے ذکر (یعنی میری یاد اور نصیحت) سے روگردانی کی تو اس کے لیے دنیاوی معاش (بھی) تنگ کر دیا جائے گا اور ہم اسے قیامت کے دن (بھی) اندھا اٹھائیں گے۔“

پہلی آیت میں بتایا گیا کہ نیک اعمال کرنے والے کو آخرت میں تو بہترین بدلہ ملے گا ہی لیکن دنیا میں بھی اُسے پاکیزہ اور باوقار زندگی میسر آئے گی جب کہ دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ کی یاد اور اُس کی اطاعت سے منہ موڑنے کا نتیجہ اُخروی سزا کے ساتھ ساتھ دنیوی زندگی میں رزق کی تنگی (رزق سے برکت کا اُٹھ جانا، رزق کے حوالے سے فقر و فاقہ اور تنگدستی کے اندیشوں میں مبتلا ہونا وغیرہ) بتایا گیا

ہے۔ چنانچہ اخلاقِ حسنہ کو اپنانے کی صورت میں انسان دنیا و آخرت کی سعادتوں کا مستحق بنتا چلا جاتا ہے جب کہ اخلاقی زوال اور انحطاط کا نتیجہ دونوں جگہوں پر بھگتنا پڑتا ہے۔ یہ قانون فرد کے لیے بھی ہے اور یہی اقوام کے لیے بھی۔ اللہ کے قانون میں کسی کے لیے کوئی رعایت نہیں ہے:

سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا۔ (الاحزاب ۳۳: ۶۲)

”اللہ کی (یہی) سنّت اُن لوگوں میں (بھی جاری رہی) ہے جو پہلے گزر چکے ہیں، اور آپ اللہ کے دستور میں ہرگز کوئی تبدیلی نہ پائیں گے۔“

اقوامِ عالم کی پوری تاریخ کی ورق گردانی کی جائے تو ہر جگہ اس قانون کی کارفرمائی دکھائی دیتی ہے۔ تاریخ کے ہر دور میں جب اور جہاں بھی کسی فرد یا قوم نے اخلاقی اُصولوں کی پاسداری کی، اللہ نے اُسے عزت و آبرو اور امن و عافیت والی زندگی عطا کی اور جہاں ان اُصولوں سے روگردانی کی گئی وہاں بالآخر قانونِ مکافاتِ عمل حرکت میں آیا اور خلاف ورزی کرنے والے فرد یا قوم کو دوسروں کے لیے نشانِ عبرت بنا دیا گیا۔ عصرِ حاضر کا انسان اخلاقی اُصولوں کو پامال کرنے کی سزا انفرادی اور اجتماعی سطح پر کس طرح بھگت رہا ہے، اس کی ایک ہلکی سی جھلک ذیل کی سطور میں دکھائی جا رہی ہے:

۱۔ سکون و اطمینان سے محرومی

انسان دو چیزوں سے عبارت ہے۔ ایک جسم اور دوسری روح۔ جسم انسانی شخصیت کا دکھائی دینے والا حصہ ہے جو مادی اجزاء سے بنا ہوا ہے چنانچہ اُس کے تقاضے بھی اسی مادی دنیا سے متعلق ہیں۔ جسم کی بقاء اور ارتقاء کے لیے جو لوازمات درکار ہیں، وہ ہمارے ارد گرد بکھرے ہوئے ہیں لیکن روح ایک ایسی لطیف چیز ہے جس کا تعلق اس مادی دنیا سے نہیں ہے بلکہ خالق کائنات سے ہے۔ چنانچہ روح کو ان مادی سامانوں سے کوئی غرض نہیں ہے۔ اُس کی صحت مندی اور تروتازگی کا دارومدار اللہ کی محبت، تعلق، یاد اور اُس کی اطاعت و بندگی پر ہے۔ اس دور کے انسان کا المیہ یہ ہے کہ اس کی توجہ کا مرکز و محور جسم کے تقاضے بن چکے ہیں جب کہ روح مسلسل نظر انداز ہو رہی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ جسم تو پھل پھول رہا ہے لیکن روح کی غذا مطلوبہ مقدار میں نہ ملنے کی وجہ سے وہ ایک قسم کے فاقہ میں مبتلا ہے اور مضطرب اور بے چین ہے۔ انسان اپنی شخصیت کے اِس خلا کو مادی ساز و سامان سے پورا کرنا چاہتا ہے اور اپنے قلبی سکون و اطمینان کو محض مادی لذتوں اور آسائشوں کے ذریعے حاصل کرنا چاہتا ہے جو کہ ناممکن ہے کیونکہ بقول قرآنِ مجید:

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔ (الرعد ۱۳: ۲۸)

”جان لو کہ اللہ ہی کے ذکر سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے۔“

اس نکتہ کو ایک مادی مثال کے ذریعے یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ اگر ایک آدمی کسی دستر خوان پر موجود ہو جہاں رنگ برنگی اور اعلیٰ درجے کی لذیذ نعمتیں وافر مقدار میں موجود ہوں لیکن پانی یا کوئی اور مشروب نہ ہو۔ کھانے کے دوران جب اُسے پیاس لگے گی تو وہاں موجود دوسری کوئی بھی چیز اُس پیاس کی تسکین نہیں کر سکے گی اور نتیجتاً طبعیت میں ایک بے چینی اور اضطراب جنم لے گا جو کسی طرح ختم نہیں ہو گا۔ یہی حال آج کے انسان کا ہے۔ تمام تر مادی سہولتوں، لذتوں، راحتوں اور آسائشوں کے باوجود اُس کا اندرونی اضطراب اور خلفشار ختم ہونے میں نہیں آرہا اور اس سے دوسری بہت ساری قباحتیں جنم لے رہی ہیں۔

۲۔ احساسات کا ضعف

اخلاقی انحطاط کا دوسرا اثر اور نتیجہ احساسات کے ضعف کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ انسان کوئی مشینی وجود نہیں ہے نہ ہی محض گوشت پوست کا بنا ہوا ہے ظاہری ڈھانچہ ہے بلکہ اس کے اندر ایک دھڑکتا ہوا دل اور ہمہ وقت متحرک رہنے والا دماغ بھی ہے جس میں نازک جذبات اور لطیف احساسات رکھے گئے ہیں جن میں سوز و گداز، محبت و مروت، ہمدردی و خیر خواہی اور ایثار و قربانی وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ عصرِ حاضر کی مشینی زندگی نے انسان کو بھی مشینی انداز میں ڈھال دیا ہے اور اُس کا یہ قیمتی سرمایہ اُس سے چھین لیا ہے بقول اقبال

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

احساسِ مروت سے مراد دل میں سوز و گداز اور تڑپ کا ہونا ہے۔ یہ احساس اقبال کے نزدیک اتنا اہم ہے کہ وہ اسے کسی بھی قیمت پر بیچنے کے لیے تیار نہیں ہے

متاعِ بے بہا ہے درد و سوز و آرزو مندی
مقامِ بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

چنانچہ مہر و وفا، خلوص، اپنائیت اور چاہت وغیرہ کے جذبات جو کبھی انسان کا طرّۂ امتیاز ہوا کرتے تھے، آج کا انسان ان سے محروم ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس کی بجائے خود غرضی، لالچ، طمع، لاپرواہی اور بے حسی و سنگدلی جیسی منفی اقدار سکّہ رائج الوقت بنتی چلی جا رہی ہیں۔ ہر کوئی اپنی ذات کے خول میں بند ہے۔ یہ بے التفاتی و لاپرواہی صرف عام انسانوں کے ساتھ ہی نہیں بلکہ قریبی رشتوں میں بھی واضح

طور پر محسوس ہو رہی ہے۔ مشینی آلات اور جدید ایجادات کی بھرمار نے انسان کو دوسرے لوگوں سے بیگانہ کر دیا ہے۔ اس صورتِ حال نے انسانوں کی بستی کو حیوانوں کی بستی میں تبدیل کر کے رکھ دیا ہے جہاں کسی کو دوسرے کے حال سے کوئی غرض نہیں ہوتی اور ہر کوئی اپنے لیے جی رہا ہوتا ہے۔

۳۔ نفسیاتی امراض اور سماجی جرائم میں اضافہ

روحانی افلاس اور اخلاقی انحطاط کا ہی ایک شاخسانہ نفسیاتی مسائل اور سماجی جرائم میں اضافہ کی صورت میں بھی نمودار ہوتا ہے۔ یوں تو تاریخ کے ہر دور میں جسمانی امراض کی طرح نفسیاتی امراض بھی موجود رہے ہیں لیکن عصرِ حاضر کی غیر فطری اور تکلفات و تعیّشات سے لبریز طرزِ زندگی نے انسان کو اخلاقی انحطاط کی جس پستی میں دھکیل دیا ہے اُس کے لازمی نتیجہ کے طور پر ذہنی و نفسیاتی مسائل بہت زیادہ بڑھ گئے ہیں۔ انسان کے اندر ضمیر (conscience) کی صورت میں ایک محاسب (auditer) رکھا گیا ہے جو اُسے ہر غلط کام پر ٹوکتا ہے۔ جب انسان ضمیر کی آواز کو نظر انداز کرتے ہوئے اخلاقی اُصولوں کو پامال کرتا ہے اور راست روی کے خلاف چلتا ہے تو اُس کے اندر ایک کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ جسے کبھی شعوری طور پر بھی محسوس کر لیا جاتا ہے اور کبھی یہ لاشعور کی سطح تک رہ جاتی ہے۔ یہی کشمکش جب بڑھتی ہے تو قلق اور اضطراب کی صورت اختیار کر لیتی ہے جس سے بہت سارے نفسیاتی امراض جنم لیتے ہیں۔ چنانچہ ڈر، خوف، وہم، وسوسے، بے بنیاد خدشے، اندیشے، اینگزائٹی اور ڈپریشن وغیرہ جیسے کتنے ہی امراض ہیں جن میں آج کے دور میں انسانوں کی ایک بہت بڑی اکثریت مبتلا ہے۔ پھر یہی امراض بہت ساری جسمانی بیماریوں کا بھی باعث بنتے ہیں۔ ماہرینِ نفسیات کے ذریعے دواؤں اور مختلف نفسیاتی تراکیب سے وقتی طور پر تو کچھ افاقہ ہو جاتا ہے لیکن جب تک کسی مسئلہ کی جڑ کو نہ پکڑا جائے تو محض شاخوں اور پتوں کی تراش خراش سے مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ آج لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد نفسیاتی امراض کی آگ میں جل رہی ہے لیکن کوئی راہ سجھائی نہیں دے رہی۔

> **غربت کے باعث انسان ایسے افعال پر مجبور ہو جاتا ہے جو اُسے کفر کی طرف لے جاتے ہیں**

☆ اخلاقی انحطاط کا ایک نتیجہ منشیات کے استعمال کی صورت میں بھی نکلتا ہے۔ انسان اپنے اندر کے قلق، اضطراب، بے چینی اور پریشانی کو ختم کرنے کے لیے کسی نہ کسی سہارے کی تلاش میں ہوتا ہے اور نشہ کا استعمال وقتی طور پر اس ضرورت کو پورا کر دیتا ہے۔ رفتہ رفتہ انسان اس کا عادی ہوتا چلا جاتا ہے۔ انسان کا اندرونی اضطراب اور قلق کبھی تو اُسے منشیات کی طرف لے جاتا ہے اور کبھی جرائم کی راہ پر ڈال دیتا ہے اور کبھی انسان کا اخلاقی اور معنوی وجود زوال اور انحطاط کا شکار ہو کر اس حد تک کھوکھلا ہو جاتا ہے کہ اُس کے اندر وہ جرأت، ہمت اور استقامت نہیں ہوتی جو زندگی کے نشیب و فراز کا مقابلہ کر سکے تو حالات کا جبر انسان کو مایوسی اور پست ہمتی کی اُس سطح پر لے جاتا ہے جہاں اُسے اُمید کی کوئی کرن دکھائی نہیں دیتی اور زندگی ایک بوجھ محسوس ہونے لگتی ہے اور وہ خودکشی کا مرتکب ہو جاتا ہے۔

اسلام نے اخلاقی اور معاشرتی بہتری کے لئے سب سے زیادہ زور عدل وانصاف پر دیا ہے

بڑھتے ہوئے ان سماجی جرائم کے سامنے بند باندھنے کی تمام کوششیں بے سود ثابت ہو رہی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تک اصل سبب کو تلاش کر کے اُس کا تدارک نہیں کیا جائے گا تب تک ان تمام سطحی اور نمائشی اقدامات سے تھوڑا بہت افاقہ تو ہو جائے گا لیکن اُس میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہو گی۔ ان تمام امور کے تدارک میں اکیلا قانون کسی بھی لحاظ سے کافی نہیں ہے بلکہ اُس کے ساتھ لوگوں کی اخلاقی حالت کو بہتر بنانے کے لیے کوشش کرنا بہت ضروری ہے۔

۴۔ جمود اور بے عملی

اخلاقی انحطاط نے انسان کو جامد اور بے عمل بھی بنا دیا ہے۔ مشینی زندگی نے لوگوں سے عزم و ہمت اور جہد مسلسل کا شعار چھین لیا ہے اور اُس کی جگہ اُنہیں بے عملی و جمود اور سستی و کاہلی میں مبتلا کر دیا ہے۔ آج کا انسان محنت و مشقت اور جفاکشی کے کاموں سے دور بھاگتا ہے۔ اُس کی بجائے وقتی تفریح، پست جذبات، سفلی خواہشات اور عارضی و فانی لذتوں میں تسکین ڈھونڈتا ہے۔ جس کے نتیجے میں زندگی حقیقی خوشیوں اور دائمی لذتوں سے محروم ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اب اس طرح کی زندگی میں وہ

کیف اور سرور کیسے آسکتا ہے جس کے متعلق علامہ اقبال نے فرمایا تھا

دو عالم سے کرتی ہے بے گانہ دل کو
عجب چیز ہے لذتِ آشنائی

دینِ اسلام میں سستی و کاہلی، جمود و تعطل اور فضول اور بے کار کاموں میں مشغولیت کو اسی لیے ناپسند کیا گیا ہے کہ یہ انسان سے اعلیٰ اخلاقی اوصاف چھین لیتی ہے اور اُسے دین و دنیا دونوں کے اعتبار سے ناکارہ بنا دیتی ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا:

من حسن اسلام المرء ترکہ مالا یعنیہ۔

(ہندی، حسام الدین، کنز العمال، ۳: ۲۵۵، رقم: ۸۲۹۱)

''آدمی کے اسلام کا حسن یہ ہے کہ وہ لایعنی کو ترک کر دے۔''

اس کی بجائے اسلام انسان کو محنت و مشقت اور جہد مسلسل کے کاموں کی ترغیب دیتا ہے۔ ارشاد فرمایا:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ۔ (البلد ۹۰: ۴)

''بے شک ہم نے انسان کو مشقت میں (مبتلا رہنے والا) پیدا کیا ہے۔''

دوسرے مقام پر فرمایا:

یٰٓاَیُّهَا الْاِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلٰقِیْهِ۔ (الانشقاق ۸۴: ۶)

''اے انسان! تو اپنے رب تک پہنچنے میں سخت مشقتیں برداشت کرتا ہے بالآخر تجھے اسی سے جا ملنا ہے۔''

حضور نے فرمایا:

ان اللہ عزوجل یحب معالی الامور۔

(طبرانی، المعجم الاوسط، ۳: ۲۱۰، رقم: ۲۹۴۰)

''اللہ تعالیٰ اعلیٰ امور کو پسند کرتے ہیں۔''

خلاصۂ کلام

اخلاقی انحطاط اور زوال کے اثرات و نتائج کی مندرجہ بالا فہرست کوئی حتمی اور قطعی نہیں ہے اس میں بڑی آسانی کے ساتھ کئی اور چیزوں کا اضافہ ہو سکتا ہے مگر اس مختصر سی فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ آج کا انسان فطری طرزِ زندگی سے منہ موڑ کر اور خلاقی اُصول و اقدار کی

خلاف ورزی کے نتیجے میں کس دلدل میں پھنس چکا ہے جہاں سے نکلنے کی کوئی راہ دکھائی نہیں دے رہی۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے انسانیت ثریا کی بلندیوں سے تحت الثری کی پستیوں میں آ گئی ہے۔ یہ صورتِ حال خود انسانیت کے مستقبل پر سوالیہ نشان لگا رہی ہے کہ اگر زوال اور انحطاط کی رفتار یہی رہی اور ماحول کے انتشار اور پراگندگی میں یونہی اضافہ ہوتا رہا تو خدانخواستہ وہ وقت نہ آ جائے جہاں انسانیت کے لیے اپنے وجود کو برقرار رکھنا ناممکن ہو جائے۔ عصرِ حاضر کے انسان کے سامنے اس سوال کا حل تلاش کیا جانا بہت ضروری ہے، اس لیے کہ اسی پر انسان کی بقاء کا انحصار ہے۔

سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی اپنے ساتھ لذت و راحت اور آسائش و زیبائش کے جو سامان لے کر آئی ہے بلا شبہ اُنہوں نے زندگی کے حسن اور خوبصورتی میں اضافہ کر دیا ہے اور اسی بنا پر آج کا انسان ماضی کی نسبت کہیں بہتر معیارِ زندگی کو اپنائے ہوئے ہے اور وہ ایسی سہولتوں سے لطف اندوز ہو رہا ہے جن کے متعلق ماضی کا انسان تصور بھی نہیں کر سکتا تھا مگر یہ تصویر کا ایک پہلو ہے۔ اسی معاملے کی دوسری جہت یہ ہے کہ یہ مادی ترقی اپنے ساتھ بہت سارے مسائل بھی لے کر آئی ہے جنہوں نے زندگی کا فطری حسن چھین لیا ہے اور اندرونی سکون و اطمینان سے آج کے انسان کو محروم کر دیا ہے۔ سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ انسان دنیوی لذتوں میں گم ہو کر اعلیٰ اخلاقی اقدار سے محروم ہو چکا ہے جس کے نتیجے میں زندگی مصنوعی، کھوکھلی، سطحی اور بناوٹی بن گئی ہے۔ یہ صورتِ حال کسی طرح بھی اطمینان بخش نہیں ہے۔ یہ انسان کی آخرت کے لیے تو تباہ کن ہے ہی مگر اس نے دنیوی زندگی کو بھی جہنم کدہ بنا دیا ہے۔ یاد رکھیں! تاریخ کا پہیہ اُلٹا نہیں گھمایا جا سکتا، جو ترقیاں ہو چکی ہیں، اُنہیں ختم نہیں کیا جا سکتا، لہٰذا کوئی راہِ اعتدال تلاش کرنا ہو گی اور اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ جو مسلمہ اخلاقی اقدار ہیں، اُنہیں مضبوطی سے تھام لیا جائے اور کسی بھی قیمت پر اُن سے محرومی کو گوارا نہ کیا جائے اور زندگی کی تمام سہولتوں سے اخلاقی اقدار کے دائرے میں رہتے ہوئے بھرپور فائدہ اٹھایا جائے۔

> **اللہ رب العزت نے فرمایا**
>
> **جس نے میرے ذکر سے**
>
> **روگردانی کی اُس کیلئے دنیاوی**
>
> **معاش تنگ کر دیا جائیگا**

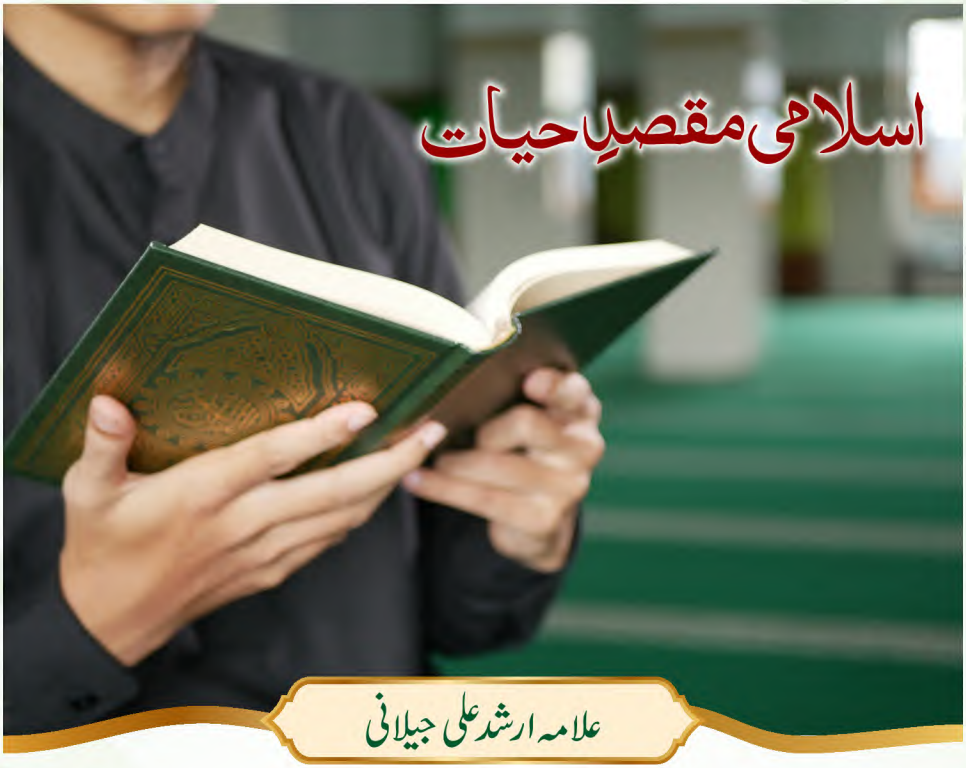

اسلامی مقصدِ حیات

علامہ ارشد علی جیلانی

کائنات ہستی اور اس کا ایک ایک وجود بلاشک وشبہ بامقصد تخلیق کیا گیا ہے۔ موجوداتِ عالم کا کوئی ذرہ ایسا نہیں جس کی پیدائش عبث اور بے مقصد ہو۔ خود قرآن حکیم اس حقیقت کی شہادت یوں دیتا ہے :

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ۔ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ (الدخان:۳۸،۳۹)

”اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ اِن کے درمیان ہے اسے محض کھیلتے ہوئے نہیں بنایا۔ ہم نے دونوں کو حق کے (مقصد و حکمت کے) ساتھ پیدا کیا ہے لیکن اُن کے اکثر لوگ نہیں جانتے۔“

لہذا اسلامی تعلیمات کے مطابق کائنات کی ہر چھوٹی بڑی چیز ایک مخصوص حکمت کے تحت، ایک متعین مدّت تک کے لیے اپنا کام کر رہی ہے۔ جب تمام چرند، پرند اور درند ایک خاص مقصد کے لیے وجود پزیر ہوئے ہیں اور بلا مقصد تخلیق کرنا خود شانِ الوہیت کے ہی منافی ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کائنات کی سب سے اشرف و افضل مخلوق ’انسان‘ کو یوں ہی بے کار، بے مقصد اور محض موج و مستی یا کھانے کمانے کے لیے پیدا کیا گیا ہو۔ رب کائنات کا کوئی بھی فعل خالی از حکمت تصور کرنا کفر ہے۔ ایسا

ہو سکتا ہے کہ کسی چیز میں پوشیدہ حکمتِ الٰہی ہماری سمجھ میں نہ آسکے لیکن اِس سے ہماری عقل کا ناقص ہونا ثابت ہوتا ہے، اللہ کی کوئی بھی تخلیق بے کار قرار نہیں دی جاسکتی۔ قرآن مجید میں بھی حیاتِ انسانی کو بے مقصد قرار نہیں دیا گیا۔ موت و حیات کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے قرآن واضح کرتا ہے:

اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفُوْرُ۔ (الملک: ۲)

"جس نے موت اور زندگی کو (اِس لیے) پیدا فرمایا کہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون عمل کے لحاظ سے بہتر ہے، اور وہ غالب ہے بڑا بخشنے والا ہے۔"

صاف ظاہر ہے کہ عملی جد وجہد کے لیے کوئی نہ کوئی مقصد اور نصب العین درکار ہوتا ہے۔ جس کے حصول کی ترغیب دی جاتی ہے اور اس کی مطابقت یا عدمِ مطابقت کے لحاظ سے جد وجہد کرنے والوں کے اعمال کا مقام متعین ہوتا ہے کہ آیا وہ شخص کامیاب رہا یا ناکام، اس نے بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کیا یا نہیں۔ قرآن مجید کے مطابق زندگی مقصد کے حصول کی جد وجہد سے عبارت ہے اور موت اس کے اخروی انجام و نتائج سے۔ اس لیے انسانی زندگی کا بامقصد ہونا خود نظامِ کائنات کے جواز کی بنیادی دلیل ہے۔

قرآن حکیم کے مطالعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان کی زندگی کا مقصد اور نصب العین "اخلاقی کمال کا حصول" ہے۔ اس سلسلے میں یہ آیت بنیادی اہمیت کی حامل ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ۔ مَآ اُرِیْدُ مِنْھُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِیْدُ اَنْ یُّطْعِمُوْنِ۔ (الذاریات: ۵۶۔۵۷)

"اور میں نے جنّات اور انسانوں کو صرف اسی لیے پیدا کیا کہ وہ میری بندگی اختیار کریں۔ نہ میں اُن سے رِزق (یعنی کمائی) طلب کرتا ہوں اور نہ اس کا طلب گار ہوں کہ وہ مجھے (کھانا) کھلائیں۔"

اس آیت نے بڑی صراحت کے ساتھ انسانی زندگی کا مقصد اور اس کی غرضِ تخلیق بیان کر دی کہ انسانوں کو پیدا کرنا اللہ تعالیٰ کی کسی اپنی حاجت کے لیے نہ تھا، کیوں کہ وہ ذات تو بے نیاز اور غنی و رزاق ہے۔ اسے کسی لحاظ سے بھی کسی مخلوق کی کوئی حاجت اور ضرورت نہ تھی، اس لیے کوئی یہ نہ سمجھے کہ تخلیقِ انسانیت میں شاید خدائے تعالیٰ کی اپنی خلاقیت کی ضرورتِ نمود و نمائش کا دخل تھا یا اس کی کسی صفت کی تکمیل اس امر کی محتاج تھی یا اس کی اپنی ہستی وجودِ خلق کی ضرورت مند تھی۔ ہرگز نہیں، اس ذات نے تمہیں پیدا کیا تو صرف اس لیے کہ تم اس کی بندگی کر کے اخلاقی کمال حاصل کر سکو۔ کیوں کہ اس کی بندگی کے شعور میں تمہاری ہی منفعت ہے اور اس کی بندگی اختیار کرنے میں تمہارا ہی کمال ہے۔

آیت مذکورہ میں ''عبادت'' کے لفظ سے شاید کسی کو یہ گمان پیدا ہو کہ عبادت اور بندگی سے مراد وہی امور ہیں جنہیں عرف عام میں عبادات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مثلاً؛ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ اور ان ہی عبادات کا بجالانا انسانی زندگی کا نصب العین ہے۔ یہ تصور غلط ہے۔ کیوں کہ قرآن عبادت اور بندگی کو انسانی تخلیق کا واحد مقصد قرار دے رہا ہے۔ اگر عبادت سے مراد محض نماز ہو تو وہ تو دن میں صرف پانچ وقت کے لیے فرض ہے۔ بقیہ اوقات میں نہیں، اس طرح یہ تصور لازم آئے گا کہ خدائے تعالیٰ نے دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں سے صرف چند لمحات پانچ نمازوں کے لیے مقرر کر کے انسان کو اپنے مقصد اور نصب العین کی طرف متوجہ کیا اور باقی سارا وقت اسے اصل مقصد تخلیق سے بے نیاز ہو کر گزارنے کے لیے چھوڑ دیا؟ اگر عبادت سے مراد محض روزہ ہو، تو وہ تو سال میں صرف ایک ماہ کے لیے فرض ہے۔ بقیہ مہینوں میں نہیں۔ اس طرح یہ تصور لازم آئے گا کہ خدائے تعالیٰ نے سال کے بارہ مہینوں میں سے صرف ایک ماہ کے لیے انسان کو اپنے مقصد اور نصب العین کی طرف متوجہ کیا اور باقی سارے عرصے میں اسے اصل مقصد سے صرف نظر کرنے کی اجازت دے دی؟ اگر عبادت سے مراد محض زکوٰۃ ہو، تو وہ بھی سال میں صرف صاحب نصاب کے لیے ایک مرتبہ فرض ہے۔ اس طرح بقیہ عرصہ میں اور دیگر لوگوں کے لیے اپنے مقصد تخلیق کی طرف متوجہ ہونے کی کوئی صورت باقی نہ رہی؟ اگر عبادت سے مراد محض حج ہو تو وہ بھی صاحب استطاعت کے لیے عمر بھر میں صرف ایک مرتبہ فرض، تو کیا بقیہ عمر مقصدِ حیات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے بسر ہو گی؟

انسان کی زندگی کا مقصد اور نصب العین اَخلاقی کمال کا حصول ہے

اگر ارکانِ اسلام کے علاوہ دیگر جملہ عبادت کو بھی شامل کر لیا جائے تو وہ ساری کی ساری مل کر بھی پوری زندگی کے ایک ایک لمحے پر محیط نہیں ہو سکتیں۔ انسان کھاتا پیتا بھی ہے، سوتا جاگتا بھی ہے۔ شادی بیاہ بھی کرتا ہے تجارت اور کاروبار بھی کرتا ہے اور دیگر ہر طرح کے معاملات زندگی بھی نبھاتا ہے۔ ان تمام معاملات کو ''عبادات'' کے زمرے میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ پھر اس سارے کاروبار حیات کو جاری رکھنے کا حکم بھی اسلام نے ہی دیا ہے، کیوں کہ اسے ترک کر کے ہمہ وقت عبادت اور ذکر و فکر میں

مشغول رہنا" رہبانیت" ہے، جسے نظام حیات کے طور پر اپنانے کی اجازت اسلام نہیں دیتا۔

عبادت کا صحیح تصور

سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سی عبادت ہے جس کو انسانی تخلیق اور اس کی حیات کا مقصد اور نصب العین قرار دیا گیا ہے جو جملہ عبادات اور معاملات حیات میں یکساں طور پر انسان کے پیش نظر رہ سکے؟ یہاں یہ امر بھی ذہن نشین رہنا چاہیے کہ اصل نصب العین اور مقصد وہ ہوتا ہے جو کسی حالت میں بھی نظر انداز نہ ہونے پائے۔ جو لمحہ مقصد سے بے توجہی اور بے التفاتی میں بسر ہو، گناہ ہوتا ہے اور بارگاہِ ربوبیت میں ناپسندیدہ۔ اگر عبادت سے مراد وہی تصور لیا جائے جو عام مذہبی ذہن میں راسخ ہے تو اس طرح انسانی زندگی کے جائز اور مشروع معاملات بھی تضاد کا شکار ہو جائیں گے۔ کیوں کہ بعض معاملات انسانی نصب العین کے مطابق ہوں گے اور بعض اس کے خلاف۔

اس الجھاؤ اور شبہ کو رفع کرنے کی صرف یہی صورت ہے کہ عبادت اور بندگی کا وہ جامع اور وسیع تصور ذہن نشین کر لیا جائے جو انسانی زندگی کے جملہ معاملات پر حاوی ہے اور جس کا تعارف خود قرآن حکیم نے ان الفاظ میں کرایا ہے:

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ۔ (البقرہ:۱۷۷)

" نیکی صرف یہی نہیں کہ تم اپنے منہ مشرق اور مغرب کی طرف پھیر لو بلکہ اصل نیکی تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ پر اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور (اللہ کی) کتاب پر اور پیغمبروں پر ایمان لائے، اور اللہ کی محبت میں (اپنا) مال قرابت داروں پر اور یتیموں پر اور محتاجوں پر اور مسافروں پر اور مانگنے والوں پر اور (غلاموں کی) گردنوں (کو آزاد کرانے) میں خرچ کرے، اور نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے اور جب کوئی وعدہ کریں تو اپنا وعدہ پورا کرنے والے ہوں، اور سختی (تنگدستی) میں اور مصیبت (بیماری) میں اور جنگ کی شدّت (جہاد) کے وقت صبر کرنے والے ہوں، یہی لوگ سچے ہیں اور یہی پرہیز گار ہیں۔"

اس آیت مبارکہ میں عبادت اور نیکی کا اصل تصور بیان کرنے سے پہلے مزعومہ تصور کی نفی کی گئی

ہے۔ اس لحاظ سے یہ تعریف جامع اور مانع ہے۔ عوام کے ذہنوں میں عام طور پر محدود تصور راسخ ہوتا ہے اور وہ نماز ہی کی طرح کی عبادت کو عبادت، نیکی اور بندگی کہتے ہیں۔ زندگی کے باقی معاملات دنیا داری تصور کیے جاتے ہیں۔ قرآن نے سب سے پہلے اس راہبانہ تصورِ عبادت کو رد کر دیا کہ اگر کوئی شخص مشرق و مغرب کی جانب یعنی قبلہ رو ہو کر نماز وغیرہ پڑھنے کو ہی نیکی اور اصل عبادت سمجھتا ہے تو یہ غلط ہے۔ اسلام کے نزدیک عبادت اور نیکی کا مفہوم اس قدر محدود نہیں کہ جس کا بقیہ عملی زندگی سے کوئی تعلق نہ ہو۔ بلکہ قرآنی تصورِ عبادت اور اسلامی مفہومِ تقویٰ اس قدر وسیع ہے جو انسان کی فکری اور عملی زندگی کے تمام گوشوں کو محیط ہے۔ اسلام کا تصور بندگی یہ ہے کہ انسانی زندگی درج ذیل خصائص کی جامع ہو:

۱۔ صحتِ عقائد: جس میں اللہ تعالیٰ، آخرت، فرشتوں، آسمانی کتابوں اور انبیاء و رسل پر ایمان لانا ضروری ہے۔

۲۔ حب الٰہی: جس کا ثبوت خلقِ خدا کے حق میں نفع بخشی، فیض رسانی اور مالی ایثار و قربانی کے ذریعہ فراہم کیا جائے۔

۳۔ مالی ایثار: اپنے وسائل دولت، مستحق رشتہ داروں، یتامیٰ و مساکین، غرباء و فقراء اور غلامی و محکومی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے انسانوں کی آزادی، معاشی بحالی اور آسودگی پر خرچ کیے جائیں۔

۴۔ صحتِ اعمال: نماز اور روزہ وغیرہ کے احکام کی پابندی کی جائے۔

۵۔ ایفائے عہد: انسان جو عہد اور فیصلہ کرے عزم و ہمت کے ساتھ اس پر ثابت قدم رہے۔

۶۔ صبر و تحمل: مصائب و شدائد کے تمام غیر معمولی حالات میں بھی صبر و تحمل اور عزم و استقلال کے ساتھ قائم رہے۔

۷۔ راہ خدا میں جد و جہد: حق کی خاطر کسی قسم کی مخالفت و مخاصمت سے نہ گھبرائے۔

مذکورہ بالا خصائص اجزاء کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان تمام اجزاء کا مجموعہ ”نیکی اور اصل عبادت“ ہے۔ گویا اصل عبادت اور بندگی ایک کُل (totality) کا نام ہے اور زندگی کے جملہ معاملات مذہبی ہوں یا دنیوی اس کُل کے مختلف اجزاء ہیں۔ جس طرح کسی ایک جزء کو الگ کر کے اسے کُل کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ اسی طرح زندگی کے کسی ایک پہلو کو دوسرے سے لاتعلق کر کے کامل بندگی کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ لہٰذا کامل عبادت اور بندگی یہ ہے کہ انسان پوری زندگی اس طرح بسر کرے جیسے اس کے خالق و مالک کی رضا ہو۔ اگر انسان نے کچھ معاملات رضائے الٰہی کے مطابق نبھائے اور کچھ اس کے خلاف تو اسے اخلاقی کمال یا کامل بندگی سے تعبیر نہیں کیا جائے گا۔

اخلاقی کمال کی اعلیٰ ترین صورت؛ حصولِ رضائے الٰہی

انسان کی زندگی کا نصب العین اخلاقی کمال ہے اور اخلاقی کمال کامل بندگی سے عبارت ہے۔ اس کی اعلیٰ ترین صورت ''رضائے الٰہی'' کا حصول ہے۔ اس لحاظ سے نتیجتاً انسان کی زندگی کا اصل نصب العین اور مقصد رضائے الٰہی قرار پایا۔ یا یوں سمجھ لیجیے کہ انسان کا مقصدِ حیات ''انسانِ مرتضیٰ'' یعنی ایسا انسان بننا ہے جس پر اس کا رب راضی ہو۔ یہ نتیجہ مذکورہ بالا آیت سے ہی نکلتا ہے جس میں خدا اور رسول اور آخرت پر ایمان لانے کے حکم کے بعد فرمایا گیا کہ انسان اللہ کی محبت میں اپنا مال رشتہ داروں، یتامیٰ اور دیگر مستحق افراد پر خرچ کرے۔

> کائنات کی ہر چھوٹی بڑی چیز نے متعینہ مدت تک اپنے حصے کا کام کرنا ہے

یہاں ایمان کے بعد ایثار اور عمل کی تلقین کی گئی ہے لیکن ایثار و عمل کے لیے جس چیز کو بطورِ محرک بیان کیا گیا ہے وہ ''حب الٰہی'' ہے۔ یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ کسی کی محبت میں ایثار و قربانی، صبر آزما جدوجہد اور مصائب و شدائد کا خوشی سے برداشت کرنا محض محبوب کی رضا کی خاطر ہوتا ہے۔ اگر محبوب کو راضی کرنا پیش نظر نہ ہو تو کوئی کیوں کر تکالیف کو دعوت دے گا اور اپنی جان و مال کی قربانی پر آمادہ ہوگا۔ اس لیے خلاصہ کلام یہ ہوا کہ اصل زندگی اور روحِ عبادت جو انسانی زندگی کا نصب العین اور مقصد وحید ہے، وہ ہر حال میں رضائے الٰہی کا حصول ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

انسانی زندگی کی خلق و بقا کا سب سے بڑا مقصد ہی رضائے الٰہی کا حاصل کرنا ہے۔ یہی وہ نعمتِ کبریٰ ہے جس کا کوئی بدل کارخانۂ حیات میں میسر نہیں آتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ۔ (توبہ: ۷۲)

'' اور (پھر) اللہ کی رضا اور خوشنودی (ان سب نعمتوں سے) بڑھ کر ہے (جو بڑے اجر کے طور پر نصیب ہو گی)۔''

جب رضائے الٰہی مقصدِ حیات بن کر انسان کی پوری زندگی پر محیط ہو جائے تو اس کا اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، سونا جاگنا، چلنا پھرنا، الغرض سارا کاروبارِ حیات ہی عبادت اور بندگی قرار پاتا ہے۔ اس کا ایک ایک

سانس اور ایک ایک لمحہ عبادت میں شمار ہوتا ہے۔ وہ شخص رضائے الٰہی کی خاطر شادی کرتا ہے تو وہ بھی عبادت ہوتی ہے۔۔۔ بیوی بچوں سے شفقت و محبت کرتا ہے تو وہ بھی عبادت ہوتی ہے۔۔۔ مشاغلِ حیات میں مصروف ہوتا ہے تو وہ بھی عبادت ہوتی ہے۔۔۔ یہاں تک کہ حیاتِ انسانی کی ہر حرکت و سکون سراسر عبادت و بندگی میں بدل جاتی ہے۔ اس تصور کو قرآن مجید یوں واضح کرتا ہے:

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَن ذِكْرِ اللهِ۔ (النور: ۳۷)

"(اللہ کے اس نور کے حامل) وہی مردانِ (خدا) ہیں جنہیں تجارت اور خرید و فروخت نہ اللہ کی یاد سے غافل کرتی ہے۔"

جس کی اپنی زندی کا ہر لمحہ خدا کی یاد اور اس کی رضا کے لیے وقف ہو، اس شخص کو دیکھنا بھی خود یاد الٰہی بن جاتا ہے۔ جیسا کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

کیا میں تمہیں ان لوگوں کے بارے میں نہ بتاؤں جو تم میں سے افضل ہیں۔ صحابہ نے عرض کیا، جی ہاں یارسول اللہ! تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: تم میں سے افضل ترین وہ لوگ ہیں جنہیں دیکھتے ہی خدا یاد آجائے۔

معلوم ہوا کہ اہلِ رضا؛ محبوبِ خدا ہوتے ہیں۔ رضائے الٰہی کو اپنا مقصود حقیقی سمجھنے والے جب اس مقصود کو عملاً پالیتے ہیں تو پھر وہ خود بھی خدا کے محبوب و مرتضی ہو جاتے ہیں اور خود رب ذوالجلال بھی انہیں اپنا مطلوب و مقصود بنالیتا ہے۔ قرآن حکیم اس حقیقت کی تائید یوں کرتا ہے:

قُلْ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللهُ۔ (آل عمران: ۳۱)

"(اے حبیب!) آپ فرما دیں: اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو تب اللہ تمہیں (اپنا) محبوب بنا لے گا۔"

اس آیت نے صراحت کے ساتھ یہ امر واضح کر دیا کہ رضائے الٰہی کی طلب بندے کو اطاعت و اتباعِ رسول اللہ ﷺ کے بعد خود محبوب و مرتضی بنا دیتی ہے۔ انسان کی جہدِ حیات کا آغاز تو حب الٰہی اور رضائے الٰہی کے حصول کی کاوش سے ہوتا ہے۔ جس میں صداقت کی شرط اتباعِ رسول ﷺ ہے۔ ورنہ حب الٰہی اور ضائے الٰہی کا دعوی کامل متصور ہی نہیں ہو سکتا۔ لیکن اتباع رسول جس کا محرک محبت ہو، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بندہ محب سے محبوب۔۔۔ طالب سے مطلوب۔۔۔ اور متلاشی رضا سے خود مرتضی و مجتبی بن جاتا ہے۔ قرآن عظیم میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمَٰنُ وُدًّا۔

"بے شک جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے تو (خدائے) رحمن ان کے

لیے (لوگوں کے) دلوں میں محبت پیدا فرما دے گا۔" (مریم:۹۶)

مذکورہ آیت مبارکہ میں ایک بہت اہم خبر دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بندۂ مومن کی محبت لوگوں کے دلوں میں ڈال دے گا اور لوگ اس کی طرف جوق در جوق کھنچنے لگتے ہیں۔ اور یہ محبت نہ صرف انسانی حدوں تک محدود ہوتی ہے بلکہ چرند و پرند، درند و حیوانات سبھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ کیونکہ ایسا بندہ اپنے مقصدِ حیات کو مکمل حاصل کر چکا ہوتا ہے۔ اب اس کے کردار و عمل سے ایسے امور کا ظہور ہوتا ہے جو مقصدیت سے بھرپور ہوتے ہیں۔ اور اس کی ہر ہر ادا اخلاقِ الٰہیہ کا آئینہ ہوتی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

وہ کون سی عبادت ہے جس کو انسانی تخلیق اور اس کی حیات کا مقصد قرار دیا گیا ہے

جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت فرماتا ہے تو جبرئیل کو ندا کر کے فرماتا ہے میں نے فلاں شخص کو محبوب و مرتضی بنالیا ہے تو بھی اسے محبت کر۔ پھر جبرئیل اس کو محبوب بنالیتے ہیں پھر وہ آسمانوں میں ندا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں شخص کو اپنا محبوب بنالیا ہے، تم بھی اس سے محبت کرو، تو آسمان والے بھی اس کو محبوب بنالیتے ہیں۔ پھر اس شخص کے لیے اہلِ زمین کے دلوں میں مقبولیت اتار دی جاتی ہے۔ یعنی اہلِ زمین بھی حکمِ الٰہی سے اسے اپنا محبوب و مقصود بنالیتے ہیں۔

مذکورہ بالا تمام آیات اور احادیث میں مختلف صورتوں سے ایک ہی حقیقت پر زور دیا گیا ہے اور وہ ہے اہلِ رضا سے تعلق، معیت، رفاقت اور وابستگی اختیار کرنا۔ کیوں کہ یہی وہ لوگ ہیں جو اپنے مقصودِ زندگی کو پا چکے ہیں۔ لہذا مقصدِ حیات اور نصب العین کی صحیح ہدایت بھی ان ہی کے راستے سے میسر آ سکتی ہے۔ یہ لوگ چونکہ صحیح معنی میں ہدایت یافتہ ہیں، اس لیے ہدایت کا اولین شعور بھی ان ہی کے راستے سے نصیب ہوتا ہے۔

خلاصۂ کلام

مقصدِ انسان؛ عبادتِ الٰہی ہے اور عبادتِ الٰہی؛ رضائے الٰہی سے عبارت ہے، گویا انسان کا مقصدِ

حیات بڑا مبارک، عظیم اور اہم ہے اور اسی تصورِ عبادت کی بنیاد پر ایک انسان کو تقرب الی اللہ میسر ہوتا ہے۔ انسانی زندگی کا اصل مقصد یہ ہے کہ اللہ کی رضا کا حصول ہو جائے اور اس کے نتیجے میں انسان حسناتِ دنیا اور حسناتِ آخرت سے فیض یاب ہو سکے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اسے یہ معلوم ہو کہ اللہ کی رضا کے لیے کیسی فکر، کیسا جذبہ اور کیا عمل درکار ہے؟ عقیدے کی درستی، جذبات و احساسات کی ہدایت اور ان کے نتیجے میں اعمالِ صالحہ کی سعی و جہد انسان سے مطلوب ہے۔ جہاں تک فکری رہنمائی کا تعلق ہے، جس کے تحت عقیدے اور جذبات و احساسات آجاتے ہیں، اس کا وافر انتظام اللہ کی کتاب اور رسول اللہ ﷺ کی سنت میں موجود ہے، جن کی بنیاد پر انسان قیامت تک آنے والے تمام مسائل کا حل تلاش کر سکتا ہے۔

انسان کی جُہدِ حیات کا آغاز حُبِ الٰہی اور رضائے الٰہی کے حصول کی کاوش سے ہوتا ہے

جب انسان اپنے مقصدِ اصلی کو چھوڑ دیتا ہے اور گناہوں میں ڈوب جاتا ہے تو وہ اپنے مقاصد سے بہت دور ہو جاتا ہے۔ جھوٹ، غیبت، چغلی، بدکاری، نافرمانی، ترکِ اوامر، ارتکابِ معاصی، لوگوں کا حق غصب کرنا، ترکِ نماز و زکوٰۃ و روزہ، کمزوروں کا حق دبانا، بڑوں کی بے ادبی کرنا، مرسلینِ عظام کے مناصب و مراتب کو گرانا، اللہ تعالیٰ کی ذات کی معرفت سے روگردانی کرنا، عذابِ الٰہی سے بے خوف ہو جانا وغیرہ، یہ ایسے امور ہیں جو یکسر مقصدِ حیات کے خلاف ہیں۔ آج معاشرے میں پائی جانے والی برائیوں کے پیچھے سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ انسان خود کو پہچان نہیں رہا ہے۔ جس نے خود کو پہچانا تو وہ دنیا کا ایک انمٹ کردار بن گیا۔ اس ضمن میں اہل بیت اطہارؑ، صحابہ کرامؓ، تابعین عظامؒ اور صوفیائے کرمؒ کا سلسلۃ الذہب اس بات پر شاہد ہے کہ ان پاکیزہ افراد نے بہر حال اپنے مقصدِ حیات کو سمجھا، جانا اور اس پر عمل کیا۔ اللہ تعالیٰ ان پاکیزہ نفوس کے صدقے ہمیں بھی مقصدِ حیات کو سمجھنے اور اس کے مطابق زندگی بسر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ امین بجاہ سید المرسلین ﷺ

نماز اور صحت

ایس ایم نور

دین اسلام کے ارکان میں سے نماز ایک اہم رکن ہے۔ نماز کو بطور عبادت قائم کرنا اور اس کے اخلاقی و روحانی مقام ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ ان تمام امور کے علاوہ نماز کے اندر ایک امر ایسا بھی ہے جس کا تعلق ہماری جسمانی صحت کے ساتھ ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے نماز کی صورت میں ہماری روحانی صحت کے ساتھ ساتھ جسمانی صحت کا بھی اہتمام فرمایا ہے۔

نماز ایک بہترین ورزش ہے۔ سستی، کاہلی اور بے عملی کے اس دور میں صرف نماز ہی ایک ایسی ورزش ہے کہ اگر اس کو صحیح طریقے سے پڑھا جائے تو دنیا کے تمام دکھوں کا مداوا بن سکتی ہے۔ نماز ایک ایسی ورزش ہے جو جسمانی اعتبار سے نہ صرف بیرونی اعضاء کی خوشنمائی و خوبصورتی کا ذریعہ ہے بلکہ طبّی نقطہ نظر سے اندرونی اعضاء، مثلاً دل، گردے، جگر، پھیپھڑے، دماغ، آنتیں، معدہ، ریڑھ کی ہڈی، گردن، سینہ اور تمام قسم کے Glands (غدود) کی نشوونما بھی کرتی ہے اور جسم کو سڈول اور خوبصورت بھی بناتی ہے۔ روحانی طور پر ہماری روح کو بالیدگی عطا کر کے روح کو قوت بخشتی ہے۔ ذہنی و نفسیاتی بیماریوں کا بہترین علاج ہے۔ نیز ظاہری اعتبار سے قیام میں عاجزی و انکساری پائی جاتی ہے مگر رکوع میں قیام کی نسبت زیادہ عاجزی کا اظہار ہوتا ہے اور سجدہ میں رکوع سے بھی زیادہ عجز و انکسار پایا جاتا ہے کیونکہ اب انسان اپنی جبین نیاز کو بارگاہِ خداوندی میں پیش کرتے ہوئے خاک آلود کرتا ہے۔ اسی

طرح آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ قیام کی طبّی و روحانی فوائد اپنی جگہ مگر رکوع میں قیام کی نسبت زیادہ حکمتیں محسوس ہوتی ہیں اور سجدہ، رکوع سے بھی زیادہ روحانی و جسمانی فوائد کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

۱۔ نماز اور فزیو تھراپی

ایک پاکستانی ڈاکٹر یورپ میں فزیو تھراپی میں اعلیٰ ڈگری کے لئے گئے، جب وہاں ان کو بالکل نماز کی طرح کی ورزش پڑھائی اور سمجھائی گئی تو وہ اس ورزش کو دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ہم نے تو آج تک نماز کو ایک دینی فریضہ سمجھا اور پڑھ لیا لیکن یہاں تو عجیب و غریب انکشافات ہیں کہ اس قسم کی ورزش کے ذریعے تو بڑے بڑے امراض ختم ہو جاتے ہیں۔ پھر ڈاکٹر صاحب نے اس ورزش سے ختم ہونے والی بیماریوں کی لسٹ دی:

۱۔ دماغی امراض ۲۔ اعصابی امراض ۳۔ نفسیاتی امراض
۴۔ بے سکونی، ڈپریشن اور بے چینی جیسے امراض
۵۔ دل کے امراض ۶۔ جوڑوں کے امراض
۷۔ یورک ایسڈ سے پیدا ہونے والے امراض
۸۔ معدے اور السر کی شکایات
۹۔ شوگر اور اس کے مابعد اثرات
۱۰۔ آنکھوں اور گلے کے امراض

۲۔ نماز اور یوگا

مسلمان 24 گھنٹوں میں پانچ نمازوں کی ادائیگی میں فرض، سنت اور نفل ملا کر کل 48 رکعت ادا کرتے ہیں جب کہ ایک رکعت میں کل 7، شکلیں اختیار کی جاتی ہیں۔ اس طرح ہر مسلمان مرد، عورت، بچہ، بوڑھا اور جوان ایک دن کی پانچ نمازوں میں سات مختلف شکلوں کو (7x48= 336) بار دہراتا ہے جبکہ ایک نماز کی ادائیگی میں اوسطاً 10 سے 15 منٹ درکار ہوتے ہیں اور اگر صرف فرض ہوں تو پانچ نمازوں میں کل سترہ فرض ہوتے ہیں، اس طرح کم از کم (7x17 = 119) شکلیں ایک دن میں اختیار کی جاتی ہیں۔

جب ایک رکعت میں اختیار کی جانے والی ان سات شکلوں کو چند یوگا چاریوں سے بیان کیا گیا تو انہوں نے انتہائی حیرت انگیز حقائق کا اظہار کیا اور کہا کہ یہ شکلیں 84 یوگا آسنوں کا مختصر ترین، آسان ترین اور بہترین مجموعہ ہیں۔ یوگا انسان کی تمام روح پر حاوی ہے اور ایک رکعت میں اختیار کی جانے والی

یہ سات شکلیں انتہائی تخلیقی اور قدرتی ہیں۔ اگر یہ حرکات ٹھیک ٹھیک پورے شعور و ذہانت کے ساتھ اور ایک وضع سے دوسری وضع میں تبدیلی آہستہ آہستہ اصولِ شریعت کے عین مطابق ہو تو نہ صرف یہ ہر عضو کو تازگی بخشتی ہے بلکہ ہماری روح کو بالیدگی اور قوت عطا کرتی ہے۔ المختصر نماز میں جو فائدہ مضمر ہے ان سے بے خبر ہو کر بھی اگر نماز کا عمل جاری رہے تب بھی وہ مجموعی طور پر انسانی زندگی کے بہتر بنانے کی طرف اپنا عمل جاری رکھتی ہے۔

مزید یہ کہ یوگی ماہرین نے نماز کو سانس کی مشق کا بالکل آسان طریقہ قرار دیا ہے۔ اس میں تین مقام خاص طور پر بیان کرتے ہیں:

۱۔ قیام اور اس میں سجدہ کی جگہ نگاہ کا ارتکاز

۲۔ رکوع میں پاؤں کی جگہ نگاہ کا ارتکاز

۳۔ سجدہ میں سانس کا ارتکاز

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ نماز اصولِ شریعت کے عین مطابق پڑھی جانی چاہئے۔ شریعت میں نماز کی ادائیگی کے لئے خشوع و خضوع پر بہت زور دیا گیا ہے اور خشوع و خضوع اخلاص اور یقین کی قوت حاصل کرنے کے لئے بار بار مشق کی ضرورت ہے۔ یاد رہے کہ خشوع اندر کے سکون، دھیان اور توجہ کا نام ہے جبکہ خضوع باہر کی ترتیب اور توجہ کا نام ہے۔ یہی دو چیزیں ٹیلی پیتھی، ہپناٹزم میں اور یوگا میں مطلوب ہیں اور یوں یہ سب مل کر علاجِ انسانی بن جاتا ہے۔

۳۔ نماز سے نفسیاتی علاج

انسان کو غم اور قلق سے نجات دینے میں نماز بہت مؤثر ہے، جب انسان زندگی کے مشاغل اور مشکلات سے کنارہ کش ہو کر پورے خشوع اور شانِ بندگی کے ساتھ نماز میں اپنے رب کے حضور کھڑا ہوتا ہے تو اس کے دل میں سکون و اطمینان پیدا ہوتا ہے۔ زندگی کی بھاری ذمہ داریوں اور مشکلات کا پیدا کردہ اعصابی تناؤ اور اضطراب ختم ہو جاتا ہے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جب بھی کوئی غم یا مشکل پیش آتی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز کی پناہ لیتے۔ جب نمازوں کے اوقات شروع ہوتے تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے فرماتے:

یا بلال ارحنا بالصلوٰۃ۔

”اے بلال رضی اللہ عنہ! نماز کے ذریعہ ہمیں راحت پہنچاؤ“۔

ان دونوں احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دل میں سکون و اطمینان پیدا کرنے میں نماز کی کس قدر

اہمیت ہے اور قلق و اضطراب سے شفایاب ہونے کے لئے نماز بڑا اہم اور موثر علاج ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ جب مشکلات گھیر لیں اور غموں کا بوجھ بڑھ جائے تو نماز سے مدد لو۔ ارشاد ربانی ہے۔

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ۔ (البقرہ، ۲: ۴۵)

”اور صبر اور نماز کے ذریعے (اللہ سے) مدد چاہو۔“

دوران نماز انسان کا اپنے رب سے جو رابطہ قائم ہوتا ہے، وہ اس میں غیر معمولی روحانی قوت پیدا کر دیتا ہے اور یہ قوت انسان کے بدن اور اس کی ذات میں اہم تبدیلیاں پیدا کرنے میں بڑی موثر ہوتی ہے۔ بسا اوقات یہ روحانی طاقت جسمِ انسانی پر اثر انداز ہو کر اعصابی تناؤ دور کر دیتی ہے اور اس کے ضعف اور امراض کا ازالہ کر دیتی ہے۔ بعض اطباء نے ذکر کیا ہے کہ بعض مریضوں کو حج اور عبادات کی بناء پر بہت تیزی سے شفا ہوئی۔

نماز سے بے سکونی، اعصابی تناؤ، جوڑوں کے مرض سمیت 10 امراض سے نجات ملتی ہے

نماز انسان کے اندر جو روحانی طاقت پیدا کرتی ہے، وہ اس پر اثر انداز ہو کر اسے پر امید بنا دیتی ہے، عزم کو قوی کرتی ہے، ہمت بلند کرتی ہے اور اس میں ایسی بے پناہ صلاحیتیں پیدا کرتی ہے کہ اس انسان میں علم و حکمت اور معرفت قبول کرنے کی بہت اہلیت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ انسان عظیم الشان شجاعانہ کارنامے انجام دینے کے لائق ہو جاتا ہے۔

نماز اس احساسِ گناہ کا بھی بہترین علاج ہے جس کی وجہ سے انسان میں قلق و اضطراب پیدا ہوتا ہے جو بہت سے نفسیاتی بیماریوں کا سبب بنتا ہے کیونکہ نماز گناہوں کو دھو دیتی ہے، خطاؤں کے میل کچیل سے نفس کو پاک کر دیتی ہے اور دل میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغفرت اور رضا کی امید پیدا کر دیتی ہے۔

رسول اکرم ﷺ صحابہ کرام کو تعلیم دیتے تھے کہ ضرورت پوری ہونے کے لئے اور مشکلات کو حل کرنے کے لئے نماز سے مدد لیں جیسے صلوٰۃ الحاجۃ، نماز استسقاء وغیرہ۔ اسی طرح مختلف حیران کن امور میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کے لئے نماز استخارہ پڑھنے کی تلقین کی گئی ہے۔

حافظ ابن قیم ”الطب النبوی“ میں نماز کے فوائد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ نماز دل کو فرحت اور قوت پہنچاتی ہے۔۔۔ دل میں بہجت و لذت پیدا کرتی ہے۔۔۔ نماز میں دل اور روح کا رابطہ اللہ جل

شانہ سے قائم ہو جاتا ہے۔۔۔ اللہ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔۔۔ اللہ کے ذکر کی نعمت حاصل ہوتی ہے۔۔۔ اللہ تعالیٰ سے سرگوشی کرنے کا لطف حاصل ہوتا ہے۔۔۔ اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضری ہوتی ہے۔۔۔ پورا بدن، بدن کی تمام قوتیں اور اعضاء اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہوتے ہیں اور ہر عضو عبادت سے بہرہ ور ہوتا ہے۔ انسان تمام مخلوقات سے کنارہ کش ہو کر اللہ کی یاد میں مشغول ہوتا ہے اور اس کے دل کی تمام قوتیں اپنے رب اور اپنے خالق کی طرف کھنچ جاتی ہیں۔ نماز کی حالت میں اسے اللہ کے دشمن (شیطان) سے راحت مل جاتی ہے۔ اس لئے نماز سب سے زیادہ شفا بخش دوا اور بہترین مقویات میں سے ہے اور ان غذاؤں میں سے ہے جو تندرست دلوں ہی کو راس آتی ہیں۔ جہاں تک بیمار دلوں کا تعلق ہے وہ بیمار جسموں کی طرح ہیں، اچھی غذائیں انہیں راس نہیں آتیں۔

نماز سے غیر معمولی روحانی قوت پیدا ہوتی اور بندے کا اللہ سے رابطہ قائم ہوتا ہے

نماز دنیا اور آخرت کے مصالح حاصل کرنے اور دنیا و آخرت کے مفاسد دور کرنے میں سب سے زیادہ معاون ہے۔ نماز گناہوں کو روکتی ہے۔۔۔ دل کے روگوں کو دور کرتی ہے۔۔۔ جسم سے امراض کا ازالہ کرتی ہے۔۔۔ دل کو روشن اور چہرے کو چمکدار بناتی ہے۔۔۔ دل اور اعضاءِ جسم میں نشاط پیدا کرتی ہے۔۔۔ رزق کو بڑھاتی ہے۔۔۔ ظلم دفع کرتی ہے اور مظلوم کی مدد کا جذبہ بیدار کرتی ہے۔۔۔ شہواتِ نفس کا قلع قمع کرتی ہے۔۔۔ نعمت کی حفاظت کرتی ہے۔۔۔ بلاؤں کو دور کرتی ہے۔۔۔ رحمت نازل کرتی ہے اور رنج و الم دور کرتی ہے۔ غرض رسول اللہ ﷺ کے مقرر کردہ، فرمودہ اور خود کردہ طریقہ سے ادا کی گئی صلوٰۃ انسان کے اندر بہت سی نفسیاتی اور تعمیری قوتیں پیدا کرتی ہے اور اعصابی تناؤ ذہنی کشمکش اور تکلیف دہ واہموں سے شفا دیتی ہے۔

تجربہ ثابت کرتا ہے کہ احساسِ خود شکستگی، احساسِ محرومی اور احساسِ تنہائی جیسی تمام مہلک بیماریوں کا تیر بہدف علاج اپنے وقتِ مقررہ یعنی اول وقت، اپنی پوری شرائط مسنونہ کے ساتھ صلوٰۃ کی پابندی ہے۔

۴۔ نماز اور ''رے کی''

''رے کی'' ایک جاپانی طریقۂ علاج ہے جس میں کائناتی توانائی کو قوتِ حیات میں تبدیل کر کے

جسمانی اور روحانی بیماریوں کا علاج کیا جاتا ہے۔ماہرین نفسیات کے مطابق انسانی دماغ کی چار (Stages)حالتیں ہوتی ہیں:

۱۔ پہلی حالت ''ایلفا سٹیج'' (Stage Alfa) کہلاتی ہے۔ اس حالت میں انسان سوچنے، سمجھنے اور سوال و جواب کے قابل ہوتا ہے جبکہ اس سٹیج کی (Frequency) 20 Circule Per Second،(20CPS)بتائی جاتی ہے۔

۲۔ دوسری سٹیج''بیٹا سٹیج'' (Beta Stage) کہلاتی ہے۔اس سٹیج میں انسان جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنے کی پوزیشن میں ہوتا ہے۔ماہرین نفسیات اس سٹیج کو انتہائی اہم اور باکمال سٹیج قرار دیتے ہیں جبکہ اس سٹیج کی فریکونسی تقریباً 14CPS بتائی جاتی ہے۔

۳۔ دماغ کی تیسری حالت کو ''ڈیلٹا سٹیج''(Delta Stage) کہتے ہیں۔ اس حالت میں انسان نیند کی سرحد میں داخل ہو جاتا ہے اور خواب کی وادی کا سیاح بنتا ہے۔ یہ سکون کی سٹیج بھی کہلاتی ہے۔

۴۔ دماغ کی چوتھی حالت کو''تھیٹا سٹیج'' (Theta Stage) کہا جاتا ہے۔اس حالت میں انسان سو تو رہا ہوتا ہے مگر خواب نہیں دیکھ پاتا، یہ انتہائی سٹیج کہلاتی ہے۔اس کی فریکونسی لامحدود (Infenty)بتائی جاتی ہے۔

المختصر چاروں دماغی سٹیجوں میں انتہائی اہم اور بامِ کمال کو پہنچنے والی سٹیج دوسری سٹیج یعنی Beta ہے کیونکہ تمام تر تخلیقی اور تعمیری قوتیں اسی سٹیج پر آکر متحرک ہوتی ہیں۔

یہاں ہم ایک حیران کن حقیقت کا انکشاف کرتے چلیں کہ امریکہ میں بیسویں صدی کے آخری عشروں میں انسانی دماغ کی فریکونسی چیک کرنے والی سیلفلو گرافک مشین Celeflographic Machine کے ذریعے نماز پڑھنے والے شخص کی دماغ کی فریکونسی کو جب چیک کیا گیا تو معلوم ہوا کہ نماز شروع کرنے سے قبل فریکونسی 20CPS تھی مگر جب اس شخص نے نماز کا آغاز کر دیا تو اس کی دماغی فریکونسی میں کمی ہونا شروع ہو گئی جو چند سیکنڈز میں کم ہوتے ہوئے بالآخر 14CPS یعنی بیٹا سٹیج پر آکر رک گئی اور پھر یہ ہی سٹیج نماز کے اختتام تک برقرار رہی۔مزید تحقیق سے یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ کم و بیش یہی کیفیت درود پاک اور دوسرے ذکر اذکار کرنے والے احباب کی بھی ہوتی ہے۔

محترم قارئین کرام! یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ اگر نماز میں دماغی سطح بیٹا سٹیج یعنی انتہائی اہم سٹیج پر رہتی ہے اور انسان کائناتی توانائی کے قریب ترین ہوتا ہے تو اس سے بڑا معجزاتی عمل اور کیا ہو گا کیونکہ ''رے کی'' طریقہ علاج میں بھی انسانی ذہن و دماغ پر سکون حالت میں کائناتی توانائی کو جذب

کرکے قابل استعمال توانائی میں تبدیل کرتا ہے اور یہی عمل دوران نماز لاشعوری طور پر عمل پذیر ہوتا ہے۔ اس طرح ہم نماز کے دوسرے تمام فیوض و برکات اور انوار و تجلیات کے ساتھ ساتھ بیماریوں سے بھی صحت یاب ہوتے ہیں۔

۵۔ نماز اور مراقبہ

نماز دین کا ایک اہم ترین رکن ہے۔ لفظ صلوۃ ایک جامع اصطلاح ہے، اس کا ایک لغوی معنٰی ''ربط قائم کرنا'' ہے۔ ربط قائم کرنے سے مراد یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ ذہنی تفکر کے ساتھ بندہ کا تعلق قائم ہو جائے۔ ذہنی تفکر (Concentration) ہی مراقبہ کہلاتا ہے۔

مراقبہ کو کسی نشست یا طریقہ کار سے مخصوص نہیں کیا جاسکتا کیونکہ مراقبہ ایک ذہنی کیفیت یا ذہنی فعل ہے۔ دین نے اعمال وارکان کا جو نظام ترتیب دیا ہے، اس میں ظاہری اور باطنی دونوں واردات کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ ہر رکن اور ہر عمل کی ایک ظاہری شکل وصورت ہے اور دوسری باطنی یا معنوی کیفیت ہے۔ ان دونوں اجزاء کا ایک ساتھ موجود ہونا ضروری ہے۔

دینی ارکان وفرائض کے ذریعے جس باطنی کیفیت کو حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، اس کی انتہا مرتبۂ احسان ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے باطنی کیفیت کی یاد دہانی ان الفاظ میں کرائی ہے:

ان تعبد اللہ کانك تراہ وان لم تکن تراہ فانہ یراك۔

''جب تم عبادت (صلوۃ وغیرہ) میں مشغول ہو تو یہ تصور کرو کہ اللہ کو دیکھ رہے ہو اور اگر تم اس کو نہ دیکھ پاؤ تو یہ محسوس کرو کہ اللہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔''

یعنی صلوۃ کسی شخص کے اندر اللہ کے سامنے موجود ہونے کا تصور بیدار کرتی اور بار بار یہ عمل دہرانے سے اللہ کی طرف متوجہ رہنے کی عادت پیدا کرتی ہے۔ صلوۃ میں زندگی کی تمام حرکات سمودی گئی ہیں تاکہ آدمی زندگی کا کوئی بھی عمل کر رہا ہو تو اللہ تعالیٰ کا تصور اس سے جدا نہ ہو۔ معلوم ہوا کہ نماز کا مقصد اللہ تعالیٰ کی طرف مکمل ذہنی رجوع ہے۔ مراقبہ کی کیفیت ہمیں گہرے سکون اور ٹھہراؤ میں لے جاتی ہے۔ یہ کیفیت ہمارے اوپر عام طور پر طاری نہیں ہوتی کیونکہ ذہن زیادہ دیر تک ایک جگہ نہیں ٹھہرتا۔ مراقبہ سے نہ صرف قوتِ ارادی میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ جسمانی اور نفسیاتی اعتبار سے بھی کثیر فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ تجربات اور مشاہدات نے ثابت کر دیا ہے کہ مراقبہ سے مندرجہ ذیل جسمانی اور نفسیاتی فوائد حاصل ہوتے ہیں:

۱۔ خون کے دباؤ پر کنٹرول
۲۔ قوتِ حیات میں اضافہ

۳۔ بصارت میں تیزی ۴۔ خون کی چکنائی میں کمی
۵۔ تخلیقی قوتوں میں اضافہ ۶۔ چڑچڑے پن میں کمی
۷۔ دل کی کارکردگی میں بہتری ۸۔ قوتِ سماعت میں اضافہ
۹۔ بیماریوں کے خلاف قوتِ مدافعت
۱۰۔ ڈپریشن اور جذباتی ہیجان کا خاتمہ
۱۱۔ پریشانی اور مشکلات میں آنے والے دباؤ میں کمی
۱۲۔ خون کے سرخ ذرات میں اضافہ
۱۳۔ قوت یادداشت میں تیزی
۱۴۔ بے خوابی سے نجات اور گہری نیند ۱۵۔ بہتر قوت فیصلہ
۱۶۔ ڈر اور خوف کے خلاف ہمت اور بہادری کا پیدا ہونا
۱۷۔ عدم تحفظ کے احساس اور مستقبل کے اندیشوں سے نجات
۱۸۔ زیادہ وسوسوں سے نجات

صلوٰۃ محض جسمانی اعضاء کی حرکت اور مخصوص الفاظ دہرانے کا نام نہیں ہے۔ نماز میں قیام، رکوع و سجود اور تلاوت جسمانی وظیفہ ہے اور رجوع الی اللہ روحانی وظیفہ ہے۔ صلوٰۃ اپنی ہیئت ترکیبی میں جسمانی اور فکری دونوں حرکات پر مشتمل ہے۔ جس طرح جسمانی اعمال ضروری ہیں، اسی طرح تصور و توجہ کا موجود ہونا بھی لازمہ صلوٰۃ ہے۔ ان دونوں اجزاء کو تمام تر توجہ سے پورا کرنا اور انکی حفاظت کرنا قیامِ صلوٰۃ ہے۔ لہذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ نماز وہ مراقبہ ہے جس میں جسمانی اعمال و حرکات کے ساتھ اللہ کی موجودگی کا تصور کیا جاتا ہے۔ جب کوئی شخص مندرجہ بالا آداب و قواعد کے ساتھ مسلسل نماز ادا کرتا ہے تو اس کے اندر انوارِ الٰہی ذخیرہ ہونے لگتے ہیں اور انوار کا یہ ذخیرہ اس کی روحانی پرواز کا سبب بنتا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ نماز کے بہت زیادہ اور بڑے عظیم فوائد ہیں۔ نماز دل میں سکون و اطمینان پیدا کرتی ہے، انسان کو احساسِ گناہ سے رہائی دلاتی ہے، خوف و اضطراب ختم کرتی ہے اور بے پناہ روحانی قوت پیدا کرتی ہے جس سے جسمانی اور نفسیاتی امراض سے شفایاب ہونے میں مدد ملتی ہے۔ نماز انسان میں زندگی اور سرگرمی پیدا کرتی ہے اور عظیم قدرت و صلاحیت سے ہمکنار کرتی ہے، جس کی بناء پر انسان بڑے بڑے کام سرانجام دے سکتا ہے۔ نماز دل کو منور کرکے اسے اس قابل بناتی ہے کہ فیضانِ ربانی قبول کرسکے۔

فاقہ اور کم خوری

شیخ الاسلام کی شہرۂ آفاق کتاب ''حُسنِ اعمال'' سے اقتباس

کم خوری اور فقر و فاقہ کی زندگی بسر کرنا سرورِ دو جہاں حضور نبی اکرم ﷺ کا زندگی بھر کا معمول رہا اور جملہ اولیاء و صوفیائے کرام آپ ﷺ کی سنتِ مبارکہ کی اتباع میں اسی روش پر گامزن رہے۔ کھانے کا مقصد زندگی کی بقاء، عبادتِ الٰہی میں تسلسل اور غور و فکر کے لئے قوت حاصل کرنا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ کھانا نہ تو اتنا زیادہ کھایا جائے کہ معدہ بوجھل ہو جائے اور نہ ہی اتنا کم کہ بھوک کی تکلیف کا احساس باعثِ آزار ٹھہرے۔ اس لئے کھانے پینے میں میانہ روی اور اعتدال کی راہ اختیار کی جائے۔ اسلام نے جہاں دیگر امورِ حیات میں اسراف سے منع کیا ہے وہاں کھانے پینے میں بھی حدِ اسراف تک پہنچنے سے روکا ہے۔

فاقہ اور کم خوری کی اَہمیت و ضرورت

بھرا ہوا پیٹ طرح طرح کی نفسانی خواہشات اور اخلاقی برائیوں کی آماجگاہ ہے۔ جاہ و مال اور مرتبہ کی محبت، ریاکاری، باہمی فخر و غرور، حسد، عداوت، بغض اور سرکشی وغیرہ یہ تمام خرابیاں ضرورت سے زیادہ کھانے اور خوب پیٹ بھرنے کا نتیجہ ہیں۔ جو شخص تزکیہ نفس کی ودلت اور معرفتِ الٰہی کی منزل تک رسائی حاصل کرنا چاہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے نفس کو کم خوری اور فاقہ کا عادی بنائے۔

کم خوری میں آپ ﷺ سے زیادہ کوئی نہ تھا، آپ ﷺ بے تحاشا بھوک برداشت کرتے

اگر انسان اپنے نفس پر بھوک کے ذریعے قابو پالے اور شیطان کے حملوں کے تدارک میں کامیاب ہو جائے تو وہ اللہ کی اطاعت کی طرف راغب ہو جاتا ہے، پھر وہ سرکشی اور تکبر کے راستوں پر چلنے کی بجائے آخرت کو دنیا پر ترجیح دیتا ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ شیطان سے چھٹکارا پانا اور خواہشاتِ نفسانی پر قابو پانا بھوک کی اذیت سہنے کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ حضرت علی ہجویریؒ فرماتے ہیں: ''بھوک صدیقین کا طعام، مریدین کا راستہ اور شیاطین کو قید کرنے کا ذریعہ ہے۔''

شیطان کس طرح انسان کو اس کی خواہشات کے جال میں پھنساتا ہے؟ اس حوالے سے شیخ شہاب الدین سہروردیؒ ایک روایت نقل کرتے ہیں:

''ایک بار ابلیس لعین حضرت یحییٰ علیہ السلام کے سامنے آیا۔ اس کے پاس بہت سے پھندے اور کانٹے تھے۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام نے دریافت کیا کہ یہ کیا ہیں؟ اس نے جواب دیا یہ خواہشاتِ دنیا ہیں جن کے ذریعے میں ابن آدم کو پھنساتا ہوں۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام نے دریافت کیا کہ کیا تو نے مجھے بھی کبھی کسی خواہش میں مبتلا پایا؟ اس نے کہا: بس ایک رات جب آپ نے خوب شکم سیر ہو کر کھایا تھا تو میں نے آپ کو نماز اور ذکر سے غافل کر دیا تھا۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام نے فرمایا: اب میں کبھی شکم سیر ہو کر نہیں کھاؤں گا۔ یہ سن کر ابلیس نے جواب دیا کہ آئندہ میں بھی کسی سے خیر خواہانہ بات نہیں کروں گا اور نہ کسی کو نصیحت کروں گا۔''

حضرت کنانیؒ فرماتے ہیں:

''مرید کے لئے تین حکم ماننے ضروری ہیں۔ وہ نیند کے غلبہ کے وقت سوئے، ضرورت سے زیادہ کلام نہ کرے اور کھانا فاقہ کے بغیر نہ کھائے۔''

طبّی حوالے سے بھی کم خوری انسان کی صحت و تندرستی کے لئے ضروری ہے۔ بسیار خوری جہاں روحانی بیماریوں کا باعث ہے وہاں بے شمار جسمانی بیماریوں کو بھی جنم دیتی ہے۔ تمام اطباء و حکماء بیماری سے بچنے کے لئے کم خوری کی تلقین کرتے ہیں۔

کم خوری کی فضیلت

کم خوری یعنی فاقہ سے رہنے کا مقام بہت بلند ہے۔ یہ عمل تمام انبیا کرام علیہم السلام کی امتوں میں پسندیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ انعاماتِ الٰہیہ کا ذریعہ اور مجاہدہ کے ارکان میں سے ایک رکن بھی ہے۔ بعض صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ بھوک زہد کی کنجی، آخرت کا دروازہ اور نفسانی خواہشات کو کمزور کرنے والی ہے۔ قرآن حکیم میں بھوک برداشت کرنے اور آزمائش میں ثابت قدم رہنے والوں کو یہ خوشخبری سنائی گئی ہے۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کم خوری کو پسند فرمایا اور اسے مومن کی نشانی قرار دیا جبکہ بسیار خوری کو ناپسند جانا اور اسے کفار کی عادت قرار دیا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

''ایک شخص بہت زیادہ کھانا کھایا کرتا تھا پھر وہ مسلمان ہو گیا تو کم کھانے لگا۔ اس بات کا تذکرہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بیشک مومن ایک آنت میں کھاتا ہے اور کافر سات آنتوں میں کھاتا ہے۔''

> اسلام نے جہاں دیگر امورِ حیات میں اسراف سے منع کیا ہے وہاں کھانے پینے میں بھی حدِ اسراف تک پہنچنے سے روکا

اس حدیثِ مبارک سے معلوم ہوا کہ کافر مومن سے سات گنا زیادہ کھاتا ہے گویا اس کی نفسانیت مومن کی خواہش سے سات گنا زیادہ بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ حدیثِ مبارک سے یہ بات بھی واضح ہوئی کہ جس دل میں ایمان کی دولت ہو گی وہ پیٹ کی خواہشات پر قابو پالے گا۔ یہی وجہ ہے کہ کم کھانے والے آخرت میں کھانے پینے کی بے شمار نعمتوں سے نوازے جائیں گے اور زیادہ کھانے والے ان سے محروم کئے جائیں گے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''جو لوگ دنیا میں سیر ہو کر کھانے والے ہیں وہ آخرت میں بھوکے ہوں گے۔''

اس حدیث مبارک کا مفہوم یہ ہے کہ جو لوگ دنیا میں بھوک پیاس برداشت کریں گے ان کے لئے آخرت میں طرح طرح کی نعمتیں اور رب رحیم کی طرف سے دعوتیں ہوں گی۔ فاقہ کش کا دل و

دماغ روشن اور طبیعت صحت مند رہتی ہے۔ بھوک نفس کو انکساری اور عجز سکھاتی اور نفس کی اشتہا کو ختم کرتی ہے جس سے بھوکے آدمی کے جسم میں منکسر مزاجی اور دل میں عاجزی پیدا ہو جاتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ صلحائے امت نے ہر دور میں کم خوری اور فاقہ کشی کو بطور عادت اپنائے رکھا اور نفلی روزوں کا اہتمام کر کے فاقہ اور کم خوری میں زندگی بسر کی۔

حضور نبی اکرم ﷺ رمضان المبارک کے فرض روزوں کے علاوہ نفلی روزوں کا خصوصی اہتمام فرماتے تھے۔ متعدد احادیثِ مبارکہ میں ایامِ بیض کے روزے (قمری مہینے کی ۱۳، ۱۴، ۱۵ تاریخ) سوموار اور جمعرات کا روزہ، یوم عرفہ کا روزہ، ماہِ شوال کے چھ روزے اور پندرہ شعبان کا روزہ کی فضیلت بیان ہوئی ہے۔

خلاصہ کلام

حضور نبی اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ امت کے لئے بہترین نمونہ ہے۔ آپ ﷺ نے امت کو جس بات کی تعلیم دی پہلے خود اس پر عمل کیا۔ اگر امت کو فقر و فاقہ اور سادگی کی تلقین کی تو سب سے پہلے اس کی مثال خود قائم کی۔ کم خوری میں آپ ﷺ سے زیادہ کوئی نہ تھا۔ آپ ﷺ بے تحاشا بھوک برداشت کرتے۔ اسی طرح آپ ﷺ کے اہل بیت اطہار اور ازواج مطہرات نے اس کا عملی نمونہ پیش کیا۔ وہ بلند پایہ مقدس ہستیاں صبر و رضا کی پیکر تھیں۔ فاقہ و کم خوری ان کا معمول تھا، کئی کئی دن گھر میں چولہا نہ جلتا، اس کے باوجود ان کی زبان پر کبھی حرفِ شکوہ نہ آیا بلکہ ہمیشہ شکر کے کلمات جاری رہتے۔

> کھانے کا مقصد زندگی کی بقاء، عبادتِ الٰہی میں تسلسل اور غور و فکر کے لئے قوت حاصل کرنا ہے

آج کا انسان بسیار خوری کی وجہ سے بے جا موٹاپا کا شکار ہے اور اس موٹاپا کی وجہ سے لاتعداد بیماریاں دامن گیر رہتی ہیں۔ موٹاپا بذاتِ خود ایک بہت بڑی بیماری ہے جو بسیاری خوری سے جنم لیتی ہے۔ جب ہم اسلام کو دینِ فطرت کہتے ہیں تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ انسان کو پیش آنے والے عوارض کا حل سیرتِ طیبہ کے ذریعے نہ دیا جائے۔ جو لوگ چاہتے ہیں کہ وہ موٹاپے کی بیماری سے نجات حاصل کر لیں اور ایک صحت مند زندگی گزارنے لگ جائیں تو وہ حضور نبی اکرم ﷺ کی کم خوری کی مبارک سُنت کو اختیار کر لیں تو وہ موٹاپے کے مرض سے نجات پا جائیں گے۔

فلسفۂ قُل اور شانِ مصطفیٰ ﷺ

ڈاکٹر حسن محی الدین قادری کی سیرت مصطفیٰ ﷺ کے تناظر میں ایمان افروز تحقیق

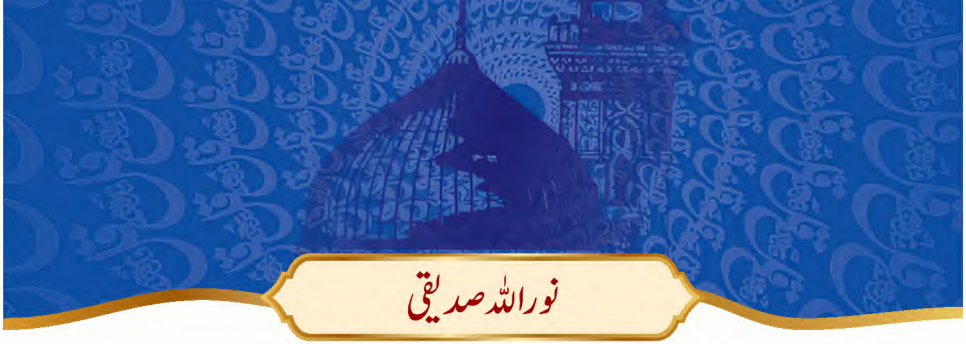

نوراللہ صدیقی

منہاج القرآن رواں صدی کی وہ واحد علمی، تحقیقی و تجدیدی تحریک ہے جس نے اُمت کو عبادات، ایمانیات، معاملات سمیت عقائد و روحانیات کے باب میں سیکڑوں پیچیدہ و دقیق موضوعات پر سیکڑوں کتب اور ہزارہا خطابات کا ایک ایسا علمی خزانہ عطا کر دیا ہے کہ آئندہ کئی صدیاں تشنگانِ علم و عرفان اس علمی خزانے سے سیراب ہوتے رہیں گے۔ تحریک منہاج القرآن کا پلیٹ فارم فی زمانہ خدمتِ دین و خدمتِ علم کا ایک ایسا چشمہ بن چکا ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا کہ علم و عرفان کے موتی اس چشمہ سے نہ اُبلتے ہوں اور ہزارہا متلاشیانِ حق کے قلوب و اذہان اس کی روشنائی اور چمک دمک سے منور و تاباں نہ ہوتے ہوں۔

حال ہی میں منہاج القرآن انٹرنیشنل کی سپریم کونسل کے چیئرمین محترم ڈاکٹر حسن محی الدین قادری کی ایک نئی کتاب ”فلسفۂ قُل اور شانِ مصطفیٰ ﷺ“ شائع ہوئی ہے۔ 600 سے زائد صفحات پر مشتمل یہ ضخیم کتاب اپنے موضوع کی نُدرت و تازگی کے اعتبار سے منفرد ہونے کے ساتھ ساتھ علوم القرآن کے باب میں ایک گراں قدر علمی و تحقیقی اضافہ ہے اور ایمانیات کے ضمن میں اس کتاب کا ایک ایک حرف عشقِ مصطفیٰ ﷺ اور ادبِ مصطفیٰ ﷺ میں ڈوبا ہوا ہے۔ چیئرمین سپریم کونسل نے اپنی اس تازہ تصنیف میں شانِ مصطفیٰ ﷺ بزبانِ کبریا کو بڑے دلنشین انداز میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ حکیم الامت نے ایک موقع پر فرمایا تھا:

خاموش اے دل! بھری محفل میں چلانا نہیں اچھا
ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں

جب کوئی سوالی آدابِ سوال کا راز پا جاتا ہے تو پھر اُس کی جھولی خالی نہیں رہتی، یہ جھولی ایسی بھرتی ہے کہ پھر اور کئی خالی جھولیاں اس خالی جھولی سے بھرنے لگ جاتی ہیں۔ دربارِ مصطفی ﷺ وہ دربارِ عالی شان ہے جس کے آداب ذاتِ کبریا نے خود بڑی تفصیل کے ساتھ بیان فرمائے ہیں۔ اللہ رب العزت نے قرآن مجید میں جا بہ جا ادبِ مصطفی ﷺ، تکریم مصطفی ﷺ، شانِ مصطفی ﷺ بیان فرما کر اُمت کو تعلیم دی ہے کہ خبردار! یہاں کسی بے ادبی کی گنجائش نہیں ہے ورنہ سمندروں سے زیادہ اور خلاؤں اور کہکشاؤں کا خالی پیٹ بھر دینے والی نیکیاں بھی لے آؤ گے تو قبول نہیں کی جائیں گی۔ ادب سے خالی عبادات آپ کے کسی کام نہیں آئیں گی۔

محترم ڈاکٹر حسن محی الدین قادری نے اپنی اس کتاب میں عقیدۂ ادبِ مصطفی ﷺ بڑی باریک بینی، عمیق نظری اور علمی و تحقیقی شان کے ساتھ بیان کیا ہے اور اُمت محمدیہ کی ایسی فکری راہ نمائی اور خدمت انجام دی ہے کہ جس کے روح پرور اثرات و ثمرات پڑھنے والے کے دل و دماغ پر ظاہر ہوتے رہیں گے اور کتاب کے ایمان افروز مندرجات قاری کا رُخ منزل حقیقی سے ہٹنے نہیں دیں گے۔

تحریک منہاج القرآن اور شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی تعلیمی و تحقیقی، دعوتی و تربیتی اور اصلاحی و فلاحی خدمات کا اگر ایک جملے میں ذکر کیا جائے تو وہ یہ ہے کہ یہ تحریک چار دہائیوں سے ادبِ مصطفی ﷺ، تکریم مصطفی ﷺ، عشقِ مصطفی ﷺ، شانِ مصطفی ﷺ کو بیان کر رہی ہے۔ اگر ادب کی منزل حاصل ہو جائے تو پھر کون و مکان کی ہر منزل مل جائے گی۔ اگر ادب کے مرحلہ پر کوتاہی ہو گئی تو پھر نگر نگر کی دھول کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔

کتاب کے پیش لفظ میں ڈاکٹر محمد تاج الدین کالامی رقم طراز ہیں کہ منفرد انداز و اسلوب پر مشتمل تفسیری شان کی حامل محترم ڈاکٹر حسن محی الدین قادری کی اِس کتاب میں دراصل لفظ ''قل'' سے تخاطب پر مشتمل آیات قرآنیہ میں مضمر حضور ﷺ کی کئی شانوں اور فلسفہ کا بیان ہے۔ اس کتاب میں مفسرین کرام کی علمی و تحقیقی آراء کو جدید علمی نظم و ترتیب کے ساتھ بیان کر کے اس اَمر کو واضح کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر اپنے محبوب نبی ﷺ کو جس طرح ایمان افروز، محبت آمیز دلنشیں اور خوبصورت انداز سے مخاطب فرمایا ہے، اس طرح لفظ ''قل'' کے ذریعے اپنے محبوب و مکرم نبی ﷺ کی مختلف، نرالی شانوں کا بیان بھی فرمایا ہے۔ مثلاً: آپ ﷺ خاتم المرسلین اور انس و جن کے رسول ہیں۔ یہ شان پہلے کسی نبی اور رسول کو عطا نہیں ہوئی۔ حضور نبی

اکرم ﷺ کی یہ بھی ایک نرالی شانِ مبارک ہے کہ اللہ نے اپنے محبوب ﷺ پر افضل، کامل اور ارفع ترین آخری آسمانی کتاب نازل کی۔ کفار اپنی تمام تر فصاحت و بلاغت اور علوم کے ہوتے ہوئے اللہ کے پاک کلام قرآن حکیم کو جو حضور نبی اکرم ﷺ کی زبانِ اقدس سے جاری ہوا چیلنج کرنے کی جرأت نہ کر سکے حتیٰ کہ آپ ﷺ پر اُترنے والی اس عظیم الشان معجز کتاب کی ایک چھوٹی سی سورت کی مثل کلام بھی پیش کرنے سے قاصر رہے۔ قرآن کا یہ اعجاز دراصل نبی محترم ﷺ کی فقید المثال شان کو اُجاگر کرنے کے لئے ہے۔

محترم ڈاکٹر حسن محی الدین قادری کی یہ تازہ علمی و تحقیقی کاوش بھی شیخ الاسلام دامت برکاتہم العالیہ کے قرآنی فکر کا تسلسل ہے۔ آپ نے اس ضخیم کتاب میں ائمہ کبار اور مفسرین کرام کی تفسیری افکار و آرا کو عام کرنے کی سعی کی ہے۔ اس کا مطالعہ تشنگانِ علم کے لئے فلسفہ قُل کے ضمن میں بیانِ شانِ مصطفی ﷺ تک رسائی کا اہم ذریعہ ثابت ہوگا۔ کتاب سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

”اللہ رب العزت نے قرآنِ مجید کی جن آیات بینات میں آقا ﷺ سے خطاب لفظِ ”قُل“ سے فرمایا ہے ان آیات کا اگر ہم تجزیہ کریں اور ان کا ایک تفصیلی جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان آیات کا تعلق کسی نہ کسی حوالے سے بلواسطہ یا بلاواسطہ دینِ اسلام اور شریعت محمدی ﷺ کے مختلف پہلوؤں یعنی احکامات اور اوامر و نواہی کے ساتھ ہے۔ گویا دونوں اعتبارات سے ”قل“ کے تناظر میں پورا دین بیان ہو جاتا ہے۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان مقامات پر دینی امور کا ابلاغ براہ راست اپنے بندوں سے کرنے کی بجائے اپنے محبوب کریم ﷺ کی زبانِ اقدس سے کروایا جس سے بلاشبہ آپ ﷺ کی بلندیٔ شان اُجاگر ہوتی ہے۔ قرآنِ مجید میں 332 مقامات پر 306 ایسی آیات وارد ہوئی ہیں کہ جن میں اللہ رب العزت نے لفظ ”قل“ کے ذریعے خطاب فرمایا ہے۔ ان میں اکثر مقامات پر مخاطب حضور نبی اکرم ﷺ ہیں جس کا مطلب ہے محبوب! آپ فرما دیجیے۔ لہٰذا وہ تمام آیات جن کا تعلق اللہ رب العزت کی توحید، اُس کی عبودیت و عبادت، اُس کی تخلیق یا اس کی شانِ قدرت کے ساتھ ہے زبانِ مصطفی ﷺ سے کہلوایا کہ ”قل“ محبوب! آپ فرما دیجئے، مگر جہاں جہاں ذاتِ مصطفی ﷺ، صفاتِ مصطفی ﷺ، شانِ مصطفی ﷺ کا مرحلہ آیا تو وہاں ”قل“ کا سہارا نہیں لیا گیا۔“

یہ کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے انتہائی دلنشیں اور ایمان افروز ہے جس کے مطالعہ سے دل اور قلب کی کیفیات بدل جائیں گی اور دربارِ مصطفی ﷺ میں ہاتھ اُٹھانے کا ادب اور سلیقہ میسر آئے گا۔ اس کتاب میں بلواسطہ طور پر ایسے فکری مغالطوں کے جوابات بھی میسر آئیں گے کہ جن پر کئی دہائیاں جھگڑے چلتے رہے۔ علمِ غیب کے حوالے سے بھی بڑی مفصل علمی بحث اس کتاب کے متن کا حصہ ہے۔

قائد ڈے نمبر فروری 2024ء

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی 73 ویں سالگرہ کے موقع پر حسبِ روایت امسال بھی ماہنامہ منہاج القرآن قائد ڈے نمبر شائع کرنے کا اعزاز حاصل کر رہا ہے۔ یہ شمارہ شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی علمی و فکری اور تجدیدی و اصلاحی ہمہ جہتی خدمات پر مشتمل ہوگا۔ علاوہ ازیں اس شمارے میں قومی و بین الاقوامی سطح پر امن و محبت کی ترویج اور بیداریٔ شعور کے لیے کی جانے والی آپ کی خدماتِ جلیلہ کو خراجِ تحسین پیش کیا جائے گا۔

اس سلسلے میں آپ بھی ماہنامہ منہاج القرآن کو اپنی خصوصی معیاری تحریریں بھجوا سکتے ہیں۔

قائد ڈے کے موقع پر آپ کی طرف سے **مبارکبادی پیغامات** کی صورت میں اشتہارات کی بکنگ بھی جاری ہے۔ آپ اپنی تحریر، مضامین اور اشتہارات سے متعلقہ اشاعتی مواد مورخہ 10 جنوری 2024ء تک ماہنامہ منہاج القرآن 365 ایم ماڈل ٹاؤن لاہور ارسال کر سکتے ہیں۔

فون: 042-111-140-140 Ext-128، mqmujallah@gmail.com

تجدید و احیائے دین، دعوت و تبلیغ حق، اصلاح احوال امت اور ترویج و اقامت اسلام کے عظیم مصطفوی مشن کے فروغ اور اسلام کی حقیقی تعلیمات سے آگہی کے لئے

ماہنامہ منہاج القرآن

کی سالانہ خریداری حاصل کریں

زیرِ سرپرستی
شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری مدظلہ

فی شمارہ: 60 روپے
سالانہ خریداری: 700 روپے

اپنے علاقے میں موجود پبلک لائبریریز، کالجز، سکولز، عوامی مقامات، دوست احباب اور علاقے کی موثر شخصیات کو سالانہ خریداری کی صورت میں تحفہ بھجوائیں

365 ایم ماڈل ٹاؤن لاہور فون: 042-111-140-140 Ext: 128
0300-8886334 Whatsapp: 0300-8105740
Web:www.minhaj.info Email:mqmujallah@gmail.com

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کا

فروغِ امن اور انسدادِ دہشت گردی کیلئے اسلامی نصاب

Monthly
MINHAJ-UL-QURAN LAHORE
JAN-2024
Regd CPL No.41

علمی و عملی، اخلاقی و روحانی، تعلیمی و سائنسی، فقہی و قانونی، انقلابی اور فکری و عصری موضوعات پر شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی 625 سے زائد کتب دستیاب ہیں